ISSN 0971-9288

www.urdubookreview.in

عام شمارہ
₹ 40

اُردو بک ریویو

اپریل - مئی - جوُن 2025

تری دُعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری   مری دُعا ہے تری آرزو بدل جائے [ضربِ کلیم]

—— علّامہ محمد اقبال [آمد: 9 نومبر 1877 — رخصت: 21 اپریل 1938]

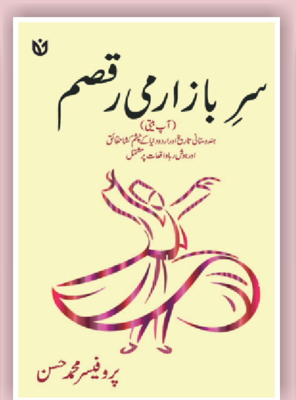

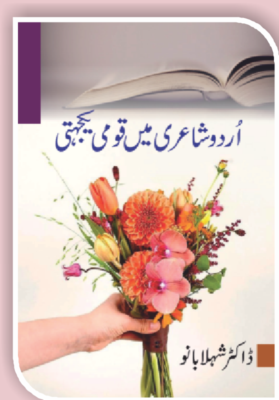

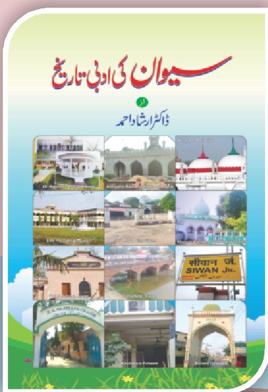

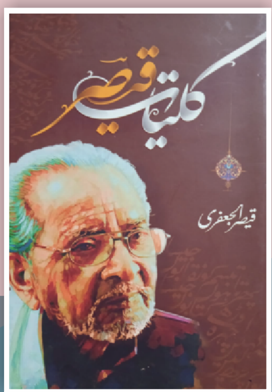

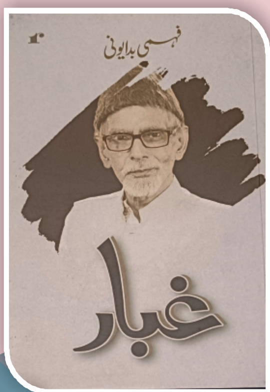

ابن صفی کی عصری معنویت

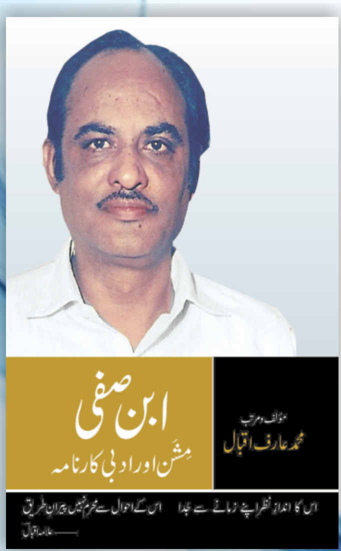

ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ

مولف ومرتب: محمد عارف اقبال

اردو میں جاسوسی ادب کے معمار
ابن صفی کی ادبی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے
ہندوستان میں پہلی بار ایک جامع کتاب۔
ابن صفی کے پرستاروں اور ابن صفی پر تحقیق کرنے والے
اسکالرز کے لیے۔
صفحات: 904 (مجلد)، نیا ایڈیشن: 2016
(حذف واضافہ شدہ)، قیمت: -/900 روپے
ISBN 978-93-83239-27-6

اوراقِ پارینہ

از: ادریس شاہجہانپوری

جاسوسی دنیا کے پیش لفظ، اداریے اور پیش رس، تفریح کے
ساتھ تحقیق کرنے والوں کے لیے
یہ کتاب تحقیق کے نئے در وا کرتی ہے۔
صفحات: 614 (مجلد)، اشاعت اول: 2023
قیمت: -/1000 روپے
ISBN 978-93-9513-423-95

رابطہ: اردو بک ریویو، نئی دہلی
Mobile: 9953630788

یہ جگہ اشتہار کے لیے خالی ہے

Website: www.urdubookreview.in

سہ ماہی

اردو بک ریویو

ISSN 0971-9288

URDU BOOK REVIEW

جلد: XXXI شمارہ: 42 اپریل، مئی، جون: 2025

شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ ۱۴۴۶ھجری

قیمت

عام شمارہ (اسٹینڈ قیمت) : 40/-

سالانہ (عام بذریعہ سادہ ڈاک) : 200/-

سالانہ (عام رجسٹرڈ ڈاک) : 350/-

سالانہ (کتب خانے وادارے) : 550/- (رجسٹرڈ ڈاک)

تاحیات (ہندوستان) : 5000/-

پاکستان، بنگلہ دیش و نیپال : 2000/- (سالانہ)

تاحیات : 15000/- (بھارتی کرنسی)

دیگر ممالک

: 35 امریکی ڈالر (سالانہ)

: 500 امریکی ڈالر تاحیات

آن لائن رقم ٹرانسفر کرنے کے لیے

Mohammad Arif Iqbal
Current A/c No. 33469561425
State Bank of India, Jama Masjid Delhi
IFSC: SBIN0002366

بینک ڈرافٹ یا ملٹی سٹی چیک پر صرف
"URDU BOOK REVIEW"
تحریر کریں۔

Registered Office
URDU BOOK REVIEW
1739/3 (Basement) New Kohinoor Hotel
Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2

ترسیل زر اور ادارتی وانتظامی امور میں رابطے کا پتہ

1739/104, First Floor, M.P. Street
Pataudi House, Darya Ganj
New Delhi-110002 Ph: [O] 011-44753890
[M] +91 9953630788 +91 9899506816
Email: urdubookreview1995@gmail.com

کمپیوٹر کمپوزنگ: اردو بک ریویو، ڈی ٹی پی ڈویژن
کمپوزیٹر: محمد عمران

مدیر
محمدّ عارف اقبال

مدیر اعزازی
ڈاکٹر سیّد تنویر حسین

سرکولیشن مینیجر
ندیم عارف
Mobile: 9953067664

مجلس ادارت

☆ ڈاکٹر شمس بدایونی (بریلی) ☆ اے۔یو۔آصف (نئی دہلی)
☆ شفیق الرحمٰن (نئی دہلی)
☆ سعید اختر اعظمی (ریاض، سعودی عرب)

مجلس مشاورت

☆ کاشف الہدیٰ (USA) ☆ رضوان احمد فلاحی (لندن)
☆ پروفیسر خالد محمود (نئی دہلی) ☆ ادریس احمد خاں (دہلی)
☆ ڈاکٹر محمد قطب الدین ابوشجاع (انڈیانا، USA)
☆ عارف محمود انصاری (مسقط، عمان)
☆ شاہ حسین نہری (اورنگ آباد، مہاراشٹر)
☆ احمد ابوسعید (حیدرآباد) ☆ سلمان غازی (ممبئی)
☆ ڈاکٹر سیّد احمد خاں (نئی دہلی) ☆ پروفیسر ارتضیٰ کریم (دہلی)
☆ انتخاب عالم انصاری (ممبرا، تھانے)
☆ عبدالرحمٰن صدیقی (ممبئی) ☆ اعزاز حسن (دہلی)

ممبر آل انڈیا اردو ایڈیٹرز کانفرنس

Under UGC Care List
Member, Press Club of India, New Delhi

Printer, Publisher and Editor: Mohammad Arif Iqbal

پرنٹر، پبلشر اور اونر محمد عارف اقبال نے اصیلا آفسیٹ پرنٹرز، 1307-08، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی-2 سے چھپوا کر دفتر اردو بک ریویو، 1739/3، (ذیلی منزل)، نیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-2 سے شائع کیا۔

ترتیب

اداریہ: پروفیسر محسن عثمانی ندوی کے دانشورانہ خیالات ملکی ملّی مسائل کے عصری تناظر میں 03-04

عرضِ ناشر: زندہ تحریریں؟ 05-06

قارئین کے تاثرات 07-09

بلا تبصرہ: آدمی نامہ [علامہ عبدالماجد دریابادی] 11

خراجِ عقیدت: ابن صفی: ہندوستان کے چند ادیب، محقق اور دانشور کی نظر میں 13-16

علم و ادب: کیوں کر عینک کو نہ آنکھوں سے لگاؤں اے یار [ابونش] 17-18

کتاب زندگی
- پروفیسر شہاب الدین ثاقب (علی گڑھ) 19
- پروفیسر مجید بیدار (حیدرآباد) 20
- ریاض احمد قادری (وارانسی) 21
- شکیل اعجاز (اکولہ، مہاراشٹر) 22

سیر حاصل: (مفصّل تبصرہ) 23-29
- سرِ بازار می رقصم [آپ بیتی] 23

نقد و تبصرہ 31-59
- کیا ہم زندہ ہیں (Self Awareness) 31
- نشریاتِ سرور (آل احمد سرور کی ریڈیائی تحریر) 33
- اصولِ تحقیق: جدید ریسرچ کے اصول وضوابط 35
- پٹنہ یونیورسٹی میں فارسی تحقیق: تعارف وتجزیہ 36
- پروفیسر محسن عثمانی ندوی: شخصیت اور پیغام 39
- خطیب اعظم: حیات وخدمات 41
- بٹوارا — کہانی ایس پی سنگھ او برائے 43
- اسرار احمد: حیات وخدمات 44
- سیوان کی ادبی تاریخ 45
- بدلتے معاشرتی اقدار اور عورت 47
- اردو شاعری میں قومی یکجہتی 49
- اک نئی بات نکل آئی ہے (مجموعہ مضامین) 51
- جدید اردو نعت: سمت رفتار (مجموعہ مضامین) 54
- کلاسیکی شاعری کی ہیئتی اصناف 55
- غالب اور میرٹھ (جلد اوّل) 57
- منتشر اوراق (مجموعہ مضامین) 59

جائزہ: اردو کتب و رسائل 61-66
- حیاتِ انقلاب ڈاکٹر محمد قطب الدین ابوشجاع 61
- بھیگی ہوئی سگریٹ (افسانوں کا مجموعہ) 62
- STAWA (Leh-Ladakh) عبدالغنی شیخ کی یاد میں 63
- عکس جمیل (شخصیات پر تاثراتی مضامین) 64
- انگلش برائے طلباء مدارس (حصہ اول تا نہم) 66

شعری ادب: (مجموعہ کلام) 67-76
- کلیات قیصر (قیصر الجعفری) 67
- غبار (فہمی بدایونی) 69
- لہو رنگ صحیفہ (کہکشاں تبسم) 72
- کلیاتِ خیر (ابوالخیر رحمانی) 74
- نقش ثباتِ دوام (ڈاکٹر محمد نفیس حسن) 76

وفیات [Obituaries]: 77-93
- ڈاکٹر عابد رضا بیدار (77) • پروفیسر خورشید احمد (78)
- علامہ غلام محمد وستانوی (80) • پروفیسر شمس الحق عثمانی (81)
- ڈاکٹر حبیب ملک فلاحی (83) • غازی علم الدین (85)
- پروفیسر نجمہ رحمانی (86) • محمد عارف (87)
- ڈاکٹر احسن ظفر اللہ (87) • پوپ فرانسس (88)
- ڈاکٹر ایم آرسری نواسن (88) • ڈاکٹر سیّد عباس متقی (89)
- شگفتہ سہسرامی (90) • میر قطب الدین علی چشتی (90)
- سیّد محمد عاقل (90) • وجے ارون (91)
- مصطفیٰ جمیل بالاپوری (92) • اختر علوی (92)
- نسیم مخموری (92) • اثر بہرائچی (92)
- راشد طراز (92) • دولت رام (93)
- شوکت جمال (93) • پروفیسر عبدالقیوم شیخ (93)

نئی کتب: [New Arrivals] 94-96

مضمون نگار یا مبصر کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پروفیسر محسن عثمانی ندوی کے دانشورانہ خیالات

ملکی ملّی مسائل کے عصری تناظر میں

دہلی یونیورسٹی شعبہ عربی کے سابق صدر، سابق استاد جواہر لعل نہرو یونیورسٹی اور سابق ڈین اسکول آف عربک اسٹڈیز و صدر شعبہ عربی ادب، انگلش اینڈ فارن لینگویجز یونیورسٹی، حیدرآباد پروفیسر محسن عثمانی ندوی (پ:28 فروری 1947) چالیس سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ چار کتابیں عربی میں بھی شائع ہوئیں۔ انہیں عربی ادب کی گراں قدر خدمات کے صلے میں صدر جمہوریہ ہند نے ایوارڈ سے سرفراز کیا تھا۔ انسانیت کا حقیقی درد رکھنے والے پروفیسر محسن عثمانی ندوی کو اُمّت مسلمہ کے مسائل سے خاص دلچسپی رہی ہے۔ ان کی کتاب 'حالات بدل سکتے ہیں' کو ایک زمانے میں بے حد داد و تحسین ملی۔ اس کتاب کا نیا ایڈیشن چند سال قبل ہی منظر عام پر آیا ہے۔ اردو زبان کے تئیں پروفیسر عثمانی بے حد حساس رہے ہیں۔ اس موضوع پر بھی ان کی دو کتابیں شائع ہوئیں۔ وہ ملک میں رواداری اور دین کے متوازن تصور کے حامی رہے ہیں۔ گزشتہ چند برسوں سے وہ علماء ہند اور دانشوروں کے رویے سے شاکی ہیں۔ اس کا اظہار انہوں نے اپنے کئی مضامین میں کیا۔ 'لسانِ قوم' کے موضوع پر ایک مختصر کتاب بھی شائع ہوئی۔ لیکن موصوف کی ان کوششوں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ پروفیسر عثمانی محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان میں جن مدارس اسلامیہ کو کارِ نبوت انجام دینا تھا، وہ اپنے نصب العین سے چشم پوشی کرتے ہوئے مجرمانہ غفلت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ 'وقف ترمیمی بل' پر ممتاز اہل فکر کی آرا سے بھی عثمانی صاحب کو بنیادی اختلاف ہے۔ پروفیسر عثمانی کا خیال ہے کہ اگر صحیح منصوبہ بندی نہیں ہو سکی تو خطرہ ہے کہ مسلمان آب کو سراب سمجھ کر دوڑتے رہیں گے اور منزل سے دور ہوتے چلے جائیں گے۔

پروفیسر محسن عثمانی ندوی کا ایک فکر انگیز مضمون جون 2025 کے ماہنامہ 'زندگی نو' نئی دہلی میں شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے 'شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات'۔ یہ مضمون عثمانی صاحب کی دردمندی اور اعلیٰ سوچ کا غماز ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''صحیح راستے سے بے گانگی کی اصل وجہ یہ رہی ہے کہ خیر اُمت کا جو مشن طے ہو گیا تھا اور جسے قرآن نے واضح طور پر بیان کر دیا تھا، صدیوں سے وہ مشن بند ہو چکا، پیغمبرانہ مشن کی گاڑی پٹری سے اتر جانے (derailment) کا شکار ہو چکی ہے، غلبہ اور قوت کا حصول پیغمبرانہ مشن کے احیا کے بغیر ممکن نہیں ہے...''

ملت اسلامیہ ہند کی موجودہ قیادت کے طے کردہ راہ عمل پر تنقید کرتے ہوئے پروفیسر عثمانی لکھتے ہیں:

''توحید کی دعوت دینے کے لیے کھڑا ہونا صرف مسلمانوں کے درمیان اصلاح اور تبلیغ کا کام نہیں ہے۔ یہ صرف حکومت کے سامنے مطالبات رکھنے کا کام نہیں ہے، یہ صرف عدالتِ عالیہ سے انصاف کا مطالبہ کا کام نہیں ہے، میری اس بات کو بہت سے لوگ ناگواری کے ساتھ سنتے ہیں اور اسے ہضم نہیں کر پاتے ہیں، اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے قرآن کے ان مقامات پر ٹھہر کر غور کیجیے جہاں ایک پیغمبر اپنی قوم سے خطاب کرتا ہے...''

علما کی بعض بنیادی غلطیوں کی نشاندہی پروفیسر عثمانی نے اس طرح کی ہے:

''علما آج بھی وہی غلطی کرتے ہیں، کسی غیر مسلم تک دین توحید پہنچانے کا انہیں خیال تک نہیں آتا ہے۔ وہ کئی جلدوں میں کسی حدیث کی کتاب کی شرح لکھتے ہیں، کئی جلدوں میں سیرت کی کوئی کتاب تصنیف کرتے ہیں، اپنے شہر اپنے محلہ اپنے پڑوس میں جو غیر مسلم ہوتا ہے وہ ان کا مرکز توجہ نہیں بنتا ہے، وہ صرف احتجاجی جلسہ کر سکتے ہیں، وہ میمورنڈم پیش کر سکتے ہیں۔ میمورنڈم پیش کرنا، جلوس

نکالنا، پندرہ منٹ کے لیے بجلی گل کرنا وغیرہ مسئلہ کا حل نہیں ہے، اس سے روشنی نہیں ہوگی۔''

پروفیسر عثمانی نے سیاسی مسلم قائدین کو بھی اپنے مضمون میں اس طرح جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے:

''ہمارے مسلم ممبرانِ پارلیمنٹ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، پارلیمنٹ میں مدلل تقریریں کرتے ہیں لیکن ان کا دعوتی مزاج ہوتا اور پیغمبرانہ مشن کا ان کو احساس ہوتا اور خیر اُمت کو جو ڈیوٹی سپرد کی گئی ہے، اس کا ان کو شعور ہوتا تو وہ وزیر اعظم کو، وزیر داخلہ اور پارلیمنٹ کے ممبروں کو اسلام کا لٹریچر بھی دیتے، قرآن کے ترجمے دیتے، سیرت پر کتابیں مطالعے کے لیے دیتے، لیکن مسلمانوں کو اپنی ڈیوٹی کا احساس نہیں ہے۔''

پروفیسر عثمانی بڑی بے بسی سے ملت اسلامیہ ہند کو متنبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''کسی کو معلوم نہیں کہ پیغمبرانہ مشن کی اہمیت کیا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ پیغمبرانہ مشن کے بند ہوجانے سے آسمان سے کیا کیا آفات اور بلیّات نازل ہوتی ہیں۔ لاکھوں اور کروڑوں مسلمانوں کے دل اور دماغ صحیح نقطہ نظر سے محروم ہیں، سمجھانے کا کام مشکل ہے، یہ میری کوشش ہے۔ شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات۔''

علما اور دانشوروں کی بے حسی کو پروفیسر عثمانی یوں بیان کرتے ہیں:

''دراصل اس کام کا تعلق اس کائنات کے سلسلے میں خدائی اسکیم سے ہے جس پر کوئی غور نہیں کرتا ہے، نہ کوئی عالم نہ کوئی عامی، نہ وہ لوگ جو مسند فضیلت پر فائز ہیں، نہ وہ جنہیں لوگ بڑا دانشور سمجھتے ہیں، ہم تمام دانشوروں کی بے دانشی سے اچھی طرح واقف ہیں۔''

قدرت کی طرف سے دی جانے والی وارننگ کے باوجود قوم کی بے حسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر عثمانی نے دوٹوک الفاظ میں اپنی بات کہی ہے۔ ان کے الفاظ میں: ''لیکن ہماری قوم غلطی پر متنبہ نہیں ہوتی، اسے اپنی غلطی کا احساس تک نہیں ہے، اسے آج تک نہیں معلوم کہ جب تک وہ خیر امت کی مفوضہ ذمہ داری کا ادراک نہیں کرے گی اور ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے کمر بستہ نہیں ہوگی، اس پر رحمتوں کا نزول نہیں ہوگا...''

عثمانی صاحب قوم کی تباہ کن صورت حال کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:

''...ایک زمانہ گزر گیا مسلمانوں کا قتل عام نہیں رکا ہے، ماب لنچنگ کے واقعات نہیں رکے ہیں، مسلم پرسنل لا میں مداخلت ختم نہیں ہوئی ہے، سینکڑوں سال پرانی مسجدوں کو منہدم کیا جارہا ہے، ان کے مکانوں پر بلڈوزر چلائے جارہے ہیں، ان کی جان، مال، زبان، تہذیب اور مذہبی آزادی سب معرضِ خطر میں ہے۔ نصاب کی کتابوں سے ان کی تاریخ کو ختم کیا جارہا ہے، ملازمتوں میں ان کے ساتھ سوتیلا سلوک کیا جارہا ہے اور عالمی پیمانہ پر بھی ان کے ساتھ یہی سلوک ہورہا ہے۔ کمال یہ ہے کہ آج ان کو یہ احساس نہیں کہ یہ سب کیوں ہورہا ہے اور نہ کوئی انہیں صحیح بات بتارہا ہے۔ سب کی بینائی مسلوب ہوگئی ہے، یہ ادراک کسی کو نہیں کہ خیر امت نے جب سے یہ ڈیوٹی ادا کرنی چھوڑ دی ہے، اسے سزائیں مل رہی ہیں...''

اپنے اس مضمون کے آخر میں پروفیسر محسن عثمانی ندوی بہ بانگ دہل کہتے ہیں:

''یاد رکھیے جب تک یہ کام نہیں ہوگا، نہ مسلم پرسنل لا بورڈ اُمت کو بچا سکے گا نہ کوئی مدرسہ، نہ کوئی تنظیم۔ دنیا کی دوسری قوموں کا کام صرف ظاہری اسباب اور تدابیر سے چل سکتا ہے۔ تدابیر بھی اہم ہیں لیکن مسلم قوم کے مسائل کا حل صرف ظاہری تدابیر میں پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کے مسائل کا حل وہاں ہے جہاں ظاہر کی آنکھ دیکھ نہیں سکتی، سینکڑوں سال گزر گئے، مسلمانوں نے بہت بڑے بڑے علمی، تعلیمی، سماجی اور اصلاحی کام کیے لیکن پیغمبرانہ مشن کے لیے کھڑا ہونا وہ کام ہے جو اُمت کو آواز دے رہا ہے۔... اگر آپ یہ کام نہیں کر رہے ہیں اور کرنے کے لیے نہیں تیار ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس اُمت کے نہ ہمدرد ہیں، نہ مخلص۔''

ایک طویل عرصے کے بعد مسلمانانِ ہند کے علما و دانشوروں کو مخاطب کرتے ہوئے عصری یونیورسٹیز کے تعلیم یافتہ ایک پروفیسر کا یہ فکر انگیز مضمون یقینی طور پر ہر مسلمان کو غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ اور اللّٰہ ہی ہمارا حامی و ناصر ہے...

—— محمد عارف اقبال

10 جون 2025

عرض ناشر

زندہ تحریریں؟...

محترم قارئین!

اس وقت سوشل میڈیا پر کرناٹک کی ایک مسلم خاتون افسانہ نگار بانو مشتاق کی تعریف کے مسلسل چرچے ہو رہے ہیں۔ اردو دنیا کو مذہب یا اردو کے نام پر کوئی کہانی مل جاتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ اس کی بانچھیں کھلنے لگتی ہیں۔ بانو مشتاق کو ملنے والے 'بوکر پرائز' کے بارے میں مختلف آرا دیکھنے کو ملیں۔ ان میں معروف محقق و نقاد شمیم طارق کا مضمون (روزنامہ انقلاب، ممبئی، 31 مئی 2025) حقیقت سے زیادہ قریب تر محسوس ہوتا ہے۔

کنڑ زبان میں 1990 سے 2023 کے درمیان بانو مشتاق کی لکھی گئی کہانیوں میں سے 12 منتخب کہانیوں کے اس مجموعہ 'ہارٹ لیمپ' (Heart Lamp) کو انگریزی قالب دیپا بھاستی نے عطا کیا ہے۔ اس مجموعہ کو 2025 کا 'بوکر پرائز' (Booker Prize) پیشے سے وکیل اور سماجی خدمت گار بانو مشتاق کو ملا ہے۔ مناسب ہوگا کہ شمیم طارق کی بات کو سمجھنے کے لیے یہاں ان کے مضمون سے چند اقتباسات نقل کیے جائیں۔ شمیم طارق چبھتے ہوئے انداز میں لکھتے ہیں:

> ''... حقیقت یہ ہے کہ ادب کے نام پر ایسے لوگ بھی اچھل کود کرتے رہے ہیں جنہوں نے تمام عمر ایسا کچھ لکھا ہی نہیں ہے جس پر ادب کی تعریف صادق آتی ہے۔ ایسے لوگ اپنی غیر ادبی سرگرمیوں کو انجام دیتے ہوئے یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ گروہ بندی یا ٹولہ بنانا مجرمین کا کام ہے، ادیبوں کا نہیں۔ اردو میں خاص طور پر ایسے لوگ بہت سرگرم ہیں جو تخلیق ادب کے نام پر صرف ادیبوں، تخلیق کاروں سے ملتے جلتے اور ان میں سے کسی کی خوشامد یا کسی کے خلاف بہتان تراشی کرتے ہیں۔ ان کی کل متاع غیبت اور بہتان تراشی ہے۔ بانو مشتاق کا کہنا ہے کہ ہندوستانی خواتین کا مزاج باغیانہ ہے مگر وہ بہت سمجھوتے کرتی ہیں۔ ان کی اس بات سے بھی مکمل اتفاق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہندوستانی معاشرہ میں خواتین اور مرد دونوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں محض اس لیے جیتے رہنا چاہیے کہ دوسروں کو عبرت ہو، ورنہ مجموعی طور پر مرد و خواتین دونوں میں اکثریت اچھوں کی ہے۔''

شمیم طارق آگے لکھتے ہیں:

''مجھے بانو مشتاق کے ایک انٹرویو (نوبھارت ٹائمز، سنیچر 24 مئی 2025) میں کہی گئی یہ بات بھی بہت اچھی لگی کہ 'میں چاہتی ہوں کہ مرد بھی خوش رہیں۔' مرد اور خاتون کے خوش اور مطمئن ہونے کی ایک ہی صورت ہے کہ ان میں رفاقت کا رشتہ اور ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کا جذبہ ہو۔ خاتون یا بیوی جب شوہر بننے کی کوشش کرتی ہے یا شوہر جب بیوی کو اپنا غلام سمجھنے لگتا ہے تو حالات بدلتے اور بگڑتے ہیں جس کے نتیجے میں گھر ٹوٹتے ہیں۔ کئی معاملات تو ایسے نظر میں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ خاتون کی زندگی میں زہر گھولنے یا میاں بیوی کو علاحدہ کرنے کا کام کسی دوسری خاتون نے کیا ہے، کسی مرد نے نہیں۔''

اپنے مضمون کے آخر میں شمیم طارق لکھتے ہیں:

''مجھے فخر ہے کہ بانو مشتاق کو بوکر پرائز کے لیے منتخب کیا گیا ہے مگر ذہن میں یہ سوال بھی ہے کہ کیا مسلم معاشرہ ویسا ہی ہے جیسا ان کی ان 12 کہانیوں میں پیش کیا گیا ہے، جن کا ترجمہ ہوا ہے اور جن کی بنیاد پر ان کو یہ گراں قدر انعام دینے کا فیصلہ ہوا ہے؟ شاید نہیں! ان سے پورے مسلم معاشرے کی تو کیا خود بانو مشتاق کی مکمل سوچ اور مشاہدے کا بھی اندازہ نہیں ہوتا۔ 'ہارٹ لیمپ' کی مترجم دیپا بھاستی نے کہانیوں میں استعمال کیے گئے مقامی زبان کے لفظوں کو 'اٹیلک' (italics) نہیں کیا ہے بلکہ بیانیہ کے ساتھ انگریزی میں 'ارے' اور 'آئیو' جیسے لفظوں کو ویسے ہی رہنے دیا ہے جیسے عام لوگ استعمال کرتے ہیں۔ یہ طریقہ انگریزی میں بھی کہانیوں کی اصل کیفیت کو برقرار رکھتا ہے۔ ان کہانیوں میں صرف مسلم معاشرہ نہیں ہندوستانی معاشرہ میں بھی صنفی (Gender) سچائی بیان کی گئی ہے۔''

قارئین اپنی آرا سے ضرور نوازیں!

4 جون 2025

—— محمد عارف اقبال
Mobile: 09953630788

قارئین کے تاثرات

□ ... 'اردو بک ریویو' کے تازہ شمارے میں خاکسار کی نئی کتاب 'غالب کچھ تحقیق، کچھ تنقید' پر عزیز مکرم ڈاکٹر ابراہیم افسر کا تبصرہ نظر سے گزرا۔ اس تبصرے میں کمپوزنگ کی غلطیوں کے علاوہ کچھ ایسی فاش غلطیاں در آئی ہیں، جن کی تصحیح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

1– صفحہ 19، کالم 2، سطر 6 (اوپر سے نیچے): ''زیرنظر کتاب کے زیادہ تر مقالات 'تنقیدی' ہیں۔'' یہ جملہ اس کتاب کی اہمیت کو سبوتاژ کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہاں 'تحقیقی' ہونا چاہیے تھا۔

2– اسی صفحہ اور کالم 2 کی سطر 20 پر: ''غالب کا ایک 'غم شدہ شعر' یہاں لفظ 'گم شدہ' تھا۔ اغلباً یہ کمپوزنگ کی غلطی ہے۔

3– صفحہ 20، کالم 1، سطر 11: ''ان میں بعض مضامین ڈاکٹر شمس بدایونی کی مذکورہ تین کتابوں میں شامل تھے۔ شمس صاحب نے ان تینوں کتابوں کے بہترین مقالات اور کچھ نئے مضامین کو زیرنظر کتاب میں شامل کیا ہے۔''

خاکسار کی غالب سے متعلق پہلی کتاب 'غالب اور بدایوں' (2004)، دوسری 'مزار غالب' (2011) اور تیسری 'تفہیم غالب کے مدارج' (2015) ہے۔ موخرالذکر یعنی تیسری کتاب غالب سے متعلق مقالات پر مشتمل ہے۔ اسی کتاب کے جملہ مقالات، سات نئے مقالات اور ایک ضمیمے کے اضافے کے ساتھ زیرتبصرہ کتاب کا حصہ بنے۔ اس کی وضاحت کتاب کے دیباچہ میں کردی گئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مبصر نے دیباچہ کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔

4– صفحہ 20، کالم 2، سطر 16: ''مرزا کی وفات سے پہلے ان کے بعض شاگردوں یعنی محمد حسین آزاد، شہاب الدین ثاقب، منشی جواہر سنگھ جواہر (صحیح جوہر) شمس الدین شمس، عزیزالحسن عزیز، عبدالغفور ناسخ نے 'آہ غالب بمُرد' سے غالب کی تاریخ وفات نکالی۔''

یہ بیان سخت گمراہ کن ہے۔ محمد حسین آزاد اور ناسخ کو غالب کے شاگردوں میں شمار کرنا، وفات سے پیشتر تلامذۂ غالب کا تاریخ وفات نکالنا میرے کسی بیان کا حصہ نہیں۔

5– صفحہ 22، کالم 1، سطر 10: ''تحریک نظم جدید اور سلسلۂ غالب میں ڈاکٹر شمس بدایونی نے ثابت کیا کہ بھلے ہی محمد حسین آزاد نے 21 جنوری 1865 کو لاہور میں انجمن پنجاب کا قیام کیا ہو۔''

خاکسار نے کہیں نہیں لکھا کہ انجمن پنجاب کا قیام مولانا محمد حسین آزاد نے کیا تھا۔ یہ مبصر کی اپنی اختراع ہے۔ خاکسار نے لکھا تھا: ''21 جنوری 1865 کو سوسائٹی فار دی ڈفیوزن آف یوزفل نالج ان دی پنجاب (یعنی انجمن اشاعت مطالب مفیدہ، پنجاب) کا قیام لاہور میں واقع شکشا بھون کی عمارت میں عمل میں آیا (ص 128)۔ اس میں محمد حسین آزاد کا نام کہاں آیا مبصر نشاندہی فرمائیں۔

6– صفحہ 22، کالم 2، سطر 11: ''مالک رام، پروفیسر حنیف نقوی اور دیگر ماہرین غالبیات نے 'دیوان غالب نسخۂ نظامی' کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد ثابت کیا کہ مذکورہ سہرا کلام غالب کا نہیں۔''

مبصر کا یہ بیان بھی کتاب میں درج بیانات سے تضاد رکھتا ہے۔ مالک رام اور حنیف نقوی نے دیوان غالب نسخۂ نظامی میں شامل اشعار پر کوئی بحث نہیں کی، البتہ غالب سے منسوب ایک شعر پر حنیف نقوی نے ضرور کلام کیا۔ دوسری بات جو سخت گمراہ کن ہے ان دو بزرگوں کی طرف منسوب کی گئی ہے کہ دیوان غالب میں شامل سہرا غالب کا نہیں۔ میں نہیں سمجھ پا رہا ہوں کہ مبصر کو یہ مغالطہ کیوں کر ہوا؟

اسی صفحے اور کالم کی سطر 18 پر مبصر نے لکھا ہے: ''محققین غالب نے نظامی پریس سے شائع دیوان غالب میں شامل سرراس مسعود کے دیباچوں کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اپنے دیباچہ میں سرراس مسعود نے غالب کے کلام میں وطن پرستی کے عناصر کو قارئین کے سامنے پیش کیا تھا... اس لحاظ سے سرراس مسعود کا دیباچہ مشکوک وغیر منصفانہ حوالوں کی بدترین مثال بن گیا۔''

اس بیان میں بھی مبصر نے ڈاکٹر سیّد محمود غازیپوری کے معروف ومشہور مقدمہ کو سرراس مسعود کا محررہ دیباچہ قرار دیا ہے اور اسے ''حوالوں کی بدترین مثال'' لکھا ہے۔ میں یہ نہیں

سمجھ پا رہا ہوں کہ مبصر نے کس عالم میں یہ تبصرہ لکھا؟

7– صفحہ 24، کالم 2، سطر 13: ''موصوف نے اپنے مضامین میں 'ترقیمے' کا خاص اہتمام کیا ہے'' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مبصر ترقیمہ کی تعریف سے واقف نہیں۔ خاکسار نے کتاب میں شامل جملہ مقالات کے آخر میں رسائل میں ان کی اولین اشاعتوں کا حوالہ دے دیا ہے، جسے مبصر نے ترقیمے سے موسوم کیا ہے۔ ترقیمہ خطی نسخوں کی اصطلاح ہے۔ مخطوطے کے آخر میں کاتب کی جانب سے لکھی گئی اختتامیہ عبارت کو ترقیمہ کہتے ہیں، مصنف سے اس کا تعلق نہیں۔

تبصرے میں جگہ جگہ جس بے خبری، ناواقفیت اور تحقیقی عبارتوں کو سمجھنے کی عدمِ صلاحیت کا مظاہرہ ہوا ہے، اس سے دلی صدمہ پہنچا۔

شمس بدایونی
58، نیو آزاد پُرم کالونی، عزت نگر، بریلی۔ (اتر پردیش)
Mobile: 9837092245

❑ ... تازہ شمارے کا اداریہ پڑھا۔ کتاب، اسمارٹ فون اور بچوں کا منفی رجحان کے عنوان کے تحت لکھی تحریر میں آپ نے جو تشویشناک حالات کو بیان کیا ہے، وہی بات میرے دل میں بھی تدریسی زمانہ سے ہی کھٹکتی رہی۔ ناچیز ادارہ دائرۃ الاصلاح (بنارس کے شعبۂ عالیہ رجال) میں کئی سال سے تدریسی

محترم قارئین!

اردو بک ریویو کی مجلس مشاورت کے بزرگ رکن اور کئی کتابوں کے مرتب محترم احمد ابوسعید صاحب (حیدرآباد) معتبر ذرائع کے مطابق سخت علیل ہیں حتیٰ کہ کسی فون کال کا گزشتہ 6 ماہ سے جواب بھی نہیں دے رہے ہیں۔ ان کا علمی اور تحقیقی کام بھی گزشتہ دو سال سے متاثر ہے۔

معزز قارئین سے گزارش ہے کہ محترم احمد ابوسعید صاحب کی صحت عاجلہ و کاملہ کے لیے خصوصی دعا فرمائیں۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ سعید بھائی کو ہر طرح کی آزمائش سے محفوظ فرمائے اور ان کے حسنات کو اللہ تعالیٰ تا حیات جاری رکھے۔ آمین!

—— محمد عارف اقبال

فرمانِ الٰہی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

...اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ ہے

ترجمہ:

''کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لیے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں؟ اس پر حال یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو یا ہدایت، یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب ○ اور اُن سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اُس چیز کی جو اللہ نے نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اُس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ اُنہی کی پیروی کریں گے خواہ شیطان ان کو بھڑکتی ہوئی آگ ہی کی طرف کیوں نہ بلاتا رہا ہو ○ جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دے اور عملاً وہ نیک ہو، اس نے فی الواقع ایک بھروسے کے قابل سہارا تھام لیا، اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ ہے ○ اب جو کفر کرتا ہے اس کا کفر تمہیں غم میں مبتلا نہ کرے، انہیں پلٹ کر آنا تو ہماری ہی طرف ہے، پھر ہم انہیں بتا دیں گے کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ یقیناً اللہ سینوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے ○ ہم تھوڑی مدّت انہیں دنیا میں مزے کرنے کا موقع دے رہے ہیں، پھر ان کو بے بس کر کے ایک سخت عذاب کی طرف کھینچ لے جائیں گے ○

[سورہ لقمان: آیات ۲۰ تا ۲۴]

ترجمانی: علّامہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

منجانب —— ایک خیر خواہ

فریضہ انجام دے رہا تھا۔ سوء اتفاق کہ 2017 میں مدرسہ کے اربابِ حل وعقد نے مجھے (نیک صفت جان کر) شعبۂ رجال سے منتقل کر کے شعبۂ نسواں میں عالمیت اور فضیلت کا کورس مکمل کرانے کے لیے بھیج دیا۔ یہ سلسلہ میرے ریٹائرمنٹ (2022) تک جاری رہا۔ دریں اثنا کووڈ 19 کا مہلک دور آ گیا۔ سرکاری آرڈر کے بموجب آن لائن تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ جن طالبات نے کبھی اپنے ہاتھ میں عام موبائل نہیں پکڑا تھا، انہیں اسمارٹ فون خریدنا پڑا۔ پھر اسے یوز کرنا سیکھا اور استعمال کرنا شروع کر دیا۔ درس کے علاوہ اوقات میں ان دوشیزاؤں نے اسمارٹ فون کا استعمال اپنے متعلقین اور سہیلیوں سے رابطہ کرنے کے علاوہ ان کاموں کے لیے بھی کیا جو کسی صورت میں بھی روا اور درست نہ تھا۔ کرونا کا دور ختم ہونے کے بعد جب ادارہ میں ان طالباتِ علومِ شرعیہ کی حاضری شروع ہوئی تو سب کے ہاتھ میں اسمارٹ فون تھا۔ نصابی کتابوں میں ان کی استعداد تو نا کے برابر تھی، آن لائن جو کچھ پڑھا انہیں بس موبائل کے ریکارڈ میں رکھا۔ لیکن غیر ضروری معلومات میں علّامہ نظر آئیں۔ اس پہ بہت افسوس ہوا۔

ریاض احمد قادری

وارانسی (اتر پردیش) ۔ رابطہ: 9839878316

❑ ... اردو بک ریویو کا تازہ شمارہ (جنوری تا مارچ 2025) موصول ہوا۔ سرورق پر امتیاز علی عرشی (مرحوم) کا شعر آج کل کے حالات کا مکمل عکاس ہے۔ اس انتخاب کے لیے آپ لائق تحسین ہیں۔ احمد حاطب صدیقی (ابونثر) کا مضمون ''آرسی کیا ہے اور مصحف کیا'' خاصے کی چیز ہے۔ اردو بک ریویو میں پابندی سے ان کے مضامین شائع ہوں تو بہتر رہے گا۔ ایسے معلوماتی مضامین قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ اردو بک ریویو کے اس شمارہ کے تمام مشمولات حسب سابق معلوماتی اور دلچسپ ہیں۔ اس کی یہی انفرادیت اسے اپنے ہم عصر رسائل وجرائد میں ممتاز بناتی ہے، اس کا کوئی ثانی ہی نہیں ہے۔ وفیات کے کالم میں تابش مہدی کے ذکر میں آپ نے بہت ساری تفصیلات دی ہیں ان کی کچھ کتابوں کے تعلق سے بھی آپ نے معلومات دی ہیں لیکن ان کی خودنوشت ''تیز دھوپ کا مسافر'' کا کالم میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ وفیات ہی کے کالم میں طارق متین مرحوم کے ذکر میں آپ نے لکھا ہے کہ 1992 کے دوران انہوں نے ماہنامہ 'علم وادب' کا اجرا کیا تھا لیکن میری معلومات کے مطابق یہ ماہانہ نہیں بلکہ ششماہی رسالہ تھا جو لکھمنیا (بیگوسرائے) سے نکلتا تھا۔ بعد میں اس کا دفتر وہ لکھمنیا سے پٹنہ میں حکیم عبدالشکور منزل لے گئے تھے۔ لیکن پھر وہ سیاست میں دلچسپی لینے کے باعث کچھ عرصے بعد ہی دہلی چلے گئے اور میرا اُن سے رابطہ نہیں رہا۔

ابرار احمد صدیقی

چھپر یہ قاضی ٹولہ، وایا بسفی، مدھوبنی-847122 (بہار)
Mobile: 9162876181

❑ ... قریب پندرہ سولہ سال پہلے ہمارے ایک بزرگ دوست پاکستان گئے تھے۔ وہاں جماعت کے مکتبہ پر جا کر انہوں نے کہا، آپ کے پاس ایسا کوئی رسالہ یا کتاب ہے جس میں کتابوں پر تبصرے ہوں تا کہ میں اسے پڑھ کر خریدنے کے لیے کتابوں کا انتخاب کر سکوں۔ مکتبہ کے ذمہ دار نے انہیں جواب دیا کہ برصغیر تو کیا پوری اردو دنیا میں کتابوں پر تبصرے کرنے والا صرف ایک رسالہ ہے اور وہ ہے 'اردو بک ریویو' دہلی۔ اس کے سوا پوری اردو دنیا میں بک ریویو کے نام پر کہیں کچھ میسر نہیں۔ ہماری تو یہ خواہش ہے کہ اردو بک ریویو ہر ماہ شائع ہو۔ مگر ہم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر عارف اقبال صاحب کو کہیں سے ڈھیر سارا خزانہ مل بھی جائے تب بھی ان کے لیے ماہانہ رسالہ نکالنا ممکن نہیں، الا یہ کہ انہیں قابل اطمینان افراد کار میسر آ جائیں۔ یہ سہ ماہی ہی تکمیل تک پہنچتے پہنچتے ان کا خون نچوڑ لیتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنی دیگر بیماریوں کے ساتھ زندہ ہیں تو یہ اللہ کا کرم اور ان کے چاہنے والوں کی دعاؤں کے طفیل ہے۔

جب بھی اردو بک ریویو ہاتھ میں آتا ہے قریب 80 فیصد تو ہم فوراً چاٹ ڈالتے ہیں۔ بقیہ 20 فیصد فرصت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے اداریہ، قارئین کے خطوط، کتاب زندگی اور سب سے زیادہ توجہ اور دلچسپی سے وفیات کا کالم پڑھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ متوفی کی زندگی کی ان خوبیوں کا پتہ چلتا

[باقی صفحہ 11]

THE GLORIOUS QURAN دی گلوریس قرآن

مستند ابتدائی آخذ پر مبنی تشریحات کے ساتھ نیا انگریزی ترجمہ قرآن

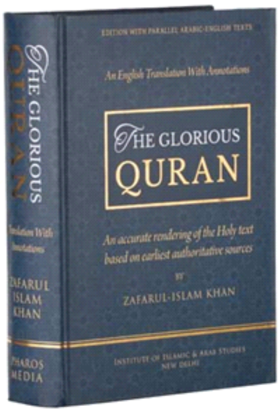

اسلام کی مقدس کتاب قرآن مجید کا درست ترین اور سلیس انگریزی ترجمہ، جس میں قرآن مجید کی تاریخ اور مسائل سمیت متعلقہ موضوعات پر وسیع تشریحات اور ضمیمے، سیرت محمدی ﷺ، اسماء اللہ الحسنیٰ، قرآن میں مذکور انبیاء علیہم السلام کا مختصر تعارف، اسلامی اصطلاحات پر مبنی لغت اور قرآن کا موضوعاتی اشاریہ شامل ہیں۔ یہ سب انتہائی مستند ابتدائی عربی آخذ پر مبنی ہے۔ قرآن اور اسلام کو سمجھنے کے لیے ایک مکمل اور مستند دستاویز۔ 11 سال کی محنت کا نتیجہ۔

ترجمہ، تشریحی حواشی اور ضمائم: ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

مترجم نے ہندوستانی مدارس میں تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں جامعۃ الازہر اور قاہرہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور مانچسٹر یونیورسٹی (انگلینڈ) سے 1987ء میں اسلامیات میں پی ایچ۔ڈی کی۔ وہ عربی، انگریزی اور اردو میں 50 سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔

انگریزی ترجمہ قرآن بشمول عربی متن، 1216 صفحات (مجلد/ ڈبل کلر)۔

ہندوستان: 1195 ر روپے / بیرون ممالک: 48 USD (ڈاک/ کوریر فری)

صرف انگریزی ایڈیشن، 816 صفحات (مجلد/ بلیک اینڈ وھائٹ)۔

ہندوستان: 795 ر روپے / بیرون ممالک: 38 USD (ڈاک/ کوریر فری)

PHAROS MEDIA & PUBLISHING PVT LTD
New Delhi
Email: books@pharosmedia.com
Mobile/WhatsApp: +91-98686-56614, +91-98181-20669;
or visit: www.pharosmedia.com

Advtt. 02/2025

آدمی نامہ☆

از: علّامہ عبدالماجد دریابادی

آدمی، سچ کہا جس نے کہا، خلاصۂ کائنات ہے۔ بڑھنے پر، اُٹھنے پر، سنورنے پر آئے تو فرشتوں سے بازی لے جائے۔ اور گھٹنے پر، گرنے پر، بگڑنے پر اُترے تو شیطان بھی اس سے نیچا دیکھ جائے۔ مذہب کی اسی بتائی ہوئی اور اخلاق کی اسی سمجھائی ہوئی بات کو نظیر اکبرآبادی نے آدمی نامہ میں ادا کیا ہے، شعر کی زبان سے، شاعرانہ آن بان سے، شاعری کے ساز و سامان سے۔

نظم کچھ ایسی بڑی نہیں۔ مخمس کے کُل 17 ہی تو بند ہیں اور اب تو مخمس کا رواج ہی اُٹھ گیا۔ نظیر کے زمانہ میں یہ شعر و سخن کی بڑی کارآمد چیز تھی۔ ہر بند میں کئی کئی نظیریں آس پاس کی لاکر، سب کی نظیر دکھا کر بتایا ہے کہ آدمی یہ بھی ہے، وہ بھی ہے بلندی، پستی، نیرنگی کے بےشمار امکانات اس کے اندر موجود۔ کہتے ہیں:

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور
یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دُور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور
شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زُور
اور ہادی رہنما ہے، سو وہ بھی ہے آدمی

بات بات میں نصیحت، اور افسانہ، حکایت، کہانی کے پردے میں اخلاق کا سبق، مشرق کا پُرانا دستور ہے۔ اور اردو میں نظیر کے شعر میں اس کا پورا ظہور ہے۔ زبان عام فہم، خیال پاکیزہ، نظیر کی اور بہت سی نظموں کی طرح آدمی نامہ کی بھی یہی خصوصیت ہے۔ زبان بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں انیسویں صدی کی ابتدا کی، ذرا پرانی اور نامانوس تو ضرور ہوگئی ہے لیکن اس میں شاعر غریب کا کیا قصور؟ وقت کی رفتار اور اس کے لازمی اثرات کو کون روک سکا ہے؟

بہرحال آدمی نامہ لکھ کر اس مرد آدمی نے حق ادا کردیا، اپنے آدم زاد ہونے کا اور مصوری کردی آدم کے پھیلے ہوئے سارے نسل و خاندان کی!

انسانی برادری کا حق، آدمیت کی تعلیم، هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ کی تفسیر اس سے بڑھ کر اردو ادب میں اور کہاں ملے گی!

کتاب: انشائے ماجد یا لطائف ادب
از: علامہ عبدالماجد دریابادی، اشاعت اول: 2000ء
ناشر: ادارہ علم و فن کراچی۔ صفحہ: 446-447

□□□

بقیہ صفحہ 9 سے آگے... تاثرات

ہے جو اس کی 70، 80 سالہ زندگی دیکھتے رہنے کے بعد بھی نہیں ملتی۔ ہم مثال دیتے ہیں۔ جماعت اسلامی والوں کی جتنی وفیات پڑھیں ایسا لگا کہ جماعت کے تمام لوگ فرشتوں سے کچھ بڑھ کر ہی تھے۔ ایک خامی تو کہیں مل جائے۔ اس کے باوجود گزشتہ چار دہائیوں سے جاری جماعت کا زوال رک نہیں رہا ہے۔ پہلے ہم اسے اپنا گمان یا ضرورت سے زیادہ حساسیت سمجھتے تھے۔ مگر تازہ اردو بک ریویو (شمارہ جنوری تا مارچ 2025) نے ہماری اس خوش فہمی کو دور کردیا۔ تازہ اردو بک ریویو نے بزرگ صحافی جلال الدین اسلم کے حوالے سے بتایا ہے کہ مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی اپنے بہت ہی قریبی لوگوں سے بڑے دکھ اور درد کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ ''جماعت ہے کہاں؟ وہ تو کب کی ختم ہوچکی ہے۔''

ممتاز میر (برہانپور، مدھیہ پردیش)
Mobile: 7697376137

☆ نشریہ یوم نظیر کے سلسلہ میں دہلی ریڈیو اسٹیشن سے 30 جون 1943 کو وقت 5 منٹ۔

3 نئی کتابیں

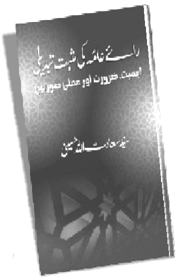

* **رائے عامہ کی مثبت تبدیلی: اہمیت، ضرورت اور عملی صورتیں** — سید سعادت اللہ حسینی

اسلام اور مسلمانوں سے متعلق ملک کی مجموعی رائے حالیہ دنوں میں تیزی سے منفی بنتی جارہی ہے۔ اس صورت حال کو بدلنا اور رائے کو مثبت بنانا اصل چیلنج ہے۔ اسی وجہ سے جماعت اسلامی ہند نے اپنی حالیہ میقات (اپریل ۲۰۲۳ تا مارچ ۲۰۲۷) کے منصوبے میں رائے عامہ کی مثبت تبدیلی کو اپنا مشن بنایا ہے۔ جماعت کے رفقا و متوسلین اس کتابچہ سے بھرپور استفادہ کریں۔

* سائز: 23X36/16 * صفحات: 40 * قیمت: 40.00

* **دینی مدارس کا نظام ونصاب: ایک تجزیاتی مطالعہ** — اشہد رفیق ندوی

دینی مدارس کے نظام تربیت، تدریس قرآن، تدریس اصول تفسیر و علوم قرآن، تدریس حدیث، تدریس فقہ، اور مدارس کے تحفظ و ارتقا جیسے موضوعات پر مختلف سمیناروں میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ۔ نظام و نصاب میں دل چسپی رکھنے والوں کے لیے اس میں بہترین رہنمائی ہے۔

* سائز: 23X36/16 * صفحات: 182 * قیمت: 150.00

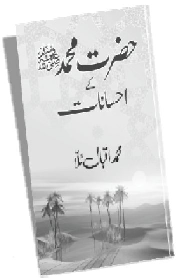

* **حضرت محمدؐ کے احسانات** — محمد اقبال ملا

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور تعلیمات میں سے ایک اہم ترین پہلو آپؐ کے عظیم احسانات ہیں۔ یہ احسانات تمام دنیا والوں پر، تمام مخلوقات پر، آپؐ کے ماننے والوں، انکار کرنے والوں اور سخت مخالفین سب پر ہیں۔ یہ کتاب خاص طور پر برادران وطن کے لیے تیار کی گئی ہے، اس لیے دعوت کے میدان میں سرگرم لوگوں کو اس سے مدد ملے گی۔

* سائز: 23X36/16 * صفحات: 146 * قیمت: 140.00

Contact No. : 7290092401, 7290092405 7290092403

MMI PUBLISHERS مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

D-307, Dawat Nagar, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025

Email: info@mmipublishers.net | mmipublishers@gmail.com | **Web:** www.mmipublishers.net

Sub Depot | **Hyderabad** : 9966710339, 9491874087, 04066710339, 8520961476 | **Mumbai** : 9699167700
Goa : 9987196549 | **Bangalore** : 9036996740, 8884045708, 9964355678

خراج عقیدت

یوم پیدائش: اپریل 1928 (جمعہ)

رخصت: 26 جولائی 1980

ابن صفی

ہندوستان کے چند ادیب، محقق اور دانشور کی نظر میں

ترتیب و پیشکش: محمد عارف اقبال

قولِ فیصل

”مجھے اُس وقت بڑی ہنسی آتی ہے جب آرٹ اور ثقافت کے علمبردار مجھ سے کہتے ہیں کہ میں ادب کی بھی کچھ خدمت کروں۔ ان کی دانست میں شاید میں جَھک مار رہا ہوں، حیات و کائنات کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جسے میں نے اپنی کسی نہ کسی کتاب میں نہ چھیڑا ہو۔ لیکن میرا طریقِ کار ہمیشہ عام روِش سے الگ تھلگ رہا ہے۔“

—— ابن صفی

ڈاکٹر یعقوب یاور

(سابق صدر، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی)

”اگر ادب انسانیت کی خدمت ہے تو ابن صفی نے یہ خدمت اپنی آخری سانس تک انجام دی ہے۔ اگر ادب خیر کی تبلیغ اور شر کی بیخ کنی کا نام ہے تو یہ بات شک کے دائرے سے باہر ہے کہ ابن صفی نے یہ فریضہ بطریق احسن انجام دیا ہے۔ اگر ادب قاری کو حقائق سے روبرو کرنے کو کہتے ہیں تو ابن صفی نے اپنے عہد اور آنے والے عہد کی سچائیوں کو عوام کے سامنے لانے کا قابل تحسین کام کیا ہے۔ اگر ادب نام ہے مناسب زبان میں اپنے مقاصد کی ترویج و اشاعت کا، تو ابن صفی نے نہایت مناسب الفاظ میں اُن مقاصد کے لیے کام کیا ہے جو اس عالم فانی میں خیر کو بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ اگر ادب نام ہے انسان کے جذبۂ حیرت کو سیراب کرنے کا تو ابن صفی کی تحریر کی ایک ایک سطر اس کے لیے وقف رہی ہے۔ ان سب کا ثبوت چاہیے تو بلاانتخاب ابن صفی کے کسی بھی ناول کا مطالعہ کیجیے، عطر آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید ...“ (صفحہ: 312)

ڈاکٹر کوثر مظہری

(صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

”اس شخص نے مغرب و مشرق کی فضاؤں کو اپنی پُراثر اور بامحاورہ زبان سے اس طرح ہم آمیز کر دیا ہے کہ ہمیں کہیں بھی اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ کسی کو اس کی زبان میں چٹخارہ محسوس ہوتا ہے تو کسی کو اس کے کردار پکڑ لیتے ہیں، اور اسی طرح کوئی اس کی پُراسرار ماجرا نگاری

میں کھوجاتا ہے۔ کیا یہ کام اتنا آسان ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ ابن صفی اپنے زمانے اور آنے والے کم از کم سَو برسوں کے اردو اسالیب نثر کے صفحے پر دستخط کی حیثیت رکھتا ہے۔'' (صفحہ:110)

ڈاکٹر شمس بدایونی (محقق، نقاد، دانشور)

''جس شخص کی زبان، ذہانت، حس مزاح وطنز نے میری شخصیت بنانے میں کسی نہ کسی درجے حصہ لیا ہو، جس نے ایک دَور میں اپنی تقلید اور نقل کرنے پر آمادہ رکھا ہو، جس نے مطالعہ کرنے کی عادت کو ہمیشہ توانائی دی ہو، اسے نظر انداز کرنا نہ پہلے اچھا لگتا تھا اور نہ آج اچھا لگتا ہے۔ ہمارے ادیبوں کے لیے وہ تیسرے درجے کا ادیب رہا ہو، لیکن میرے لیے وہ ایک معلّم، رہبر اور استاد کا درجہ رکھتا ہے۔ جس نے میری زبان و بیان کو درست کیا، ذہانت کو بروئے کار لانے کا ہنر سکھایا، شخصیات کو ان ہی کی حدود میں پیش کرنے کا سلیقہ دیا، ہر خبر کے پیچھے چھپی خبر پر نظر ڈالنے کی عادت ڈلوائی، انسانی شخصیتوں کی نفسیاتی پیچیدگیوں، تضادات اور گناہوں کے پس پشت خاندانی محرومیوں کو سمجھنے کا طریقہ سمجھایا، پھر سب سے بڑی بات زندگی کو فطری قوانین کے دائرے میں جینے کا حوصلہ دیا۔''
(صفحہ:88-87)

عالم نقوی (معروف سینئر صحافی، دانشور)

''ابن صفی کی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ وہ 'ادبی منافقت' سے کوسوں دور تھے۔ جدیدیت کے 'فاشزم' اور مابعد جدیدیت کے 'انارکزم' اور 'نہلیزم' سے بھی ان کو کوئی واسطہ نہ تھا۔ ادب عالیہ کے نام پر جنسی جگالی بھی ان کا شیوہ نہ تھا۔ وہ ادب کے ان منشیوں میں بھی نہیں تھے کہ جنہوں نے بقول فضیل جعفری تخلیق کم کی اور جو، کرب کا ڈھنڈورہ زیادہ پیٹتے رہے۔ وہ نفسِ انسانی کی معرفت رکھنے والے زمانہ شناس ادیب تھے۔ انہوں نے اپنی غیر معمولی کردار نگاری کے ذریعے سماج کو صرف آئینہ ہی نہیں دکھایا بلکہ اپنی ہر کہانی میں آفاقی سچائیوں اور اعلیٰ انسانی اقدار کی طرف واضح رہنمائی بھی کی۔'' (صفحہ:89)

ڈاکٹر محمد رفعت

(سابق پروفیسر فزکس، شعبہ اپلائیڈ سائنس، JMI، نئی دہلی)

''انسانی زندگی کو اخلاقی قدروں سے آزاد کرنے کا جو رجحان مغرب میں شروع ہوا، اس نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو متاثر کیا۔ ان میں ادب بھی شامل ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے انگریزی ادب کے مقابلے میں بعد کی تحریروں کا جائزہ لیا جائے تو ان پر اباحیت اور بے راہ روی کے اثرات صاف نظر آسکتے ہیں۔ انگریزی ادب کے ہر موڑ کا اثر اردو اور ہندی ادب پر بھی پڑتا رہا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی ان دو بڑی زبانوں میں 'ادب برائے ادب' کا نعرہ مقبول ہوا، جو اصلاً ادب کو اخلاقی قدروں سے بے گانہ کرنے کی کوشش کا ہی دوسرا نام تھا۔ ابن صفی نے اس تہذیبی فضا کے علی الرغم ادب میں تعمیری رویے کی طرح ڈالی اور وقت کے غالب رجحان کے خلاف جرأت کے ساتھ بغاوت کی۔ ابن صفی کا افسانوی ادب جو جاسوسی اور غیر جاسوسی دونوں اقسام پر مشتمل ہے، کامیابی کے ساتھ آفاقی اخلاقی قدروں کی ترجمانی کرتا ہے۔'' (صفحہ:506)

پروفیسر عقیل ہاشمی

(سابق چیئرمین، شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد)

''ابن صفی جیسے البیلے صاحب طرز اور جادو نگار ادیب، کہنے دیجیے صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں جو ندرت کمال، جاذبیت، سحر طرازی اور انفرادیت ملتی ہے، وہ کب کہاں نظر آئی۔ ان کا اسلوب والہانہ،

دلگداز، ہمہ گیر، پُرکشش اور منفرد طرزِ فکر کا غماز ہے۔''
(صفحہ:293)

ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی

(سابق استاذ، ڈاکٹر ذاکر حسین کالج، دہلی)

''مولانا عامر عثمانی (ایڈیٹر، ماہنامہ تجلی دیوبند) ابن صفی کے پرستار تھے اور پابندی سے جاسوسی دنیا کا مطالعہ کرتے۔ انہیں ان ناولوں کے دلچسپ فقرے ازبر تھے۔ اپنی گفتگو میں برجستگی کے ساتھ استعمال کرتے اور دوران گفتگو کہتے جاتے دیکھو بھائی! یہ بات میں نے نہیں کہی، ابن صفی نے لکھی ہے۔''

''پروفیسر امیر عارفی بتاتے تھے کہ معروف دانشور اور ماہر تعلیم پروفیسر مونس رضا ان دنوں علی گڑھ میں تھے۔ ان کے مطالعہ کا وقت مقرر تھا لیکن جاسوسی دنیا کے آنے پر ان کے معمولات میں فرق آجاتا۔ وہ پورے انہماک سے ناول پڑھتے اور جب تک ناول نہیں پڑھ لیتے، کمرے کا دروازہ نہیں کھولتے۔'' (صفحہ:133)

محمد شعیب کوٹی ندوی

(ممبئی کے معروف دانشور، محقق، معلم)

''ابن صفی نے اپنی تحریروں کے ذریعے کئی نسلوں کی تربیت کی ہے۔ انہوں نے جو ادب تخلیق کیا اس میں سنجیدہ لب ولہجہ کے ساتھ بے ساختہ فطری مزاح وظرافت کی روایتیں، ان کا اپنا خاصہ ہے۔ پھوہڑپن کے ساتھ مزاح و ظرافت کا اظہار ہر ایک کے لیے سہل ہے لیکن سنجیدگی کے دائرہ میں رہ کر نکتہ آفرینی اور مزاح پیدا کرنا مشکل فن ہے۔ جو اس مشکل کو سر کر لیتے ہیں وہی وضع داری اور پاس ومروت کے نقیب بنتے ہیں۔ ابن صفی اس فن کے امام تھے، انہوں نے جو کچھ لکھا وہ ہر ایک کے لیے قابل قبول ہے۔'' (صفحہ:103)

ڈاکٹر امتیاز احمد

(سابق ڈائرکٹر، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ)

''اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان میں سرّی ادب یا جاسوسی افسانوں کا کوئی مقام طے کیا جائے گا تو ابن صفی کا نام سرفہرست ہوگا۔ ناقدینِ ادب اس سلسلہ میں جو بھی رائے قائم کریں یا فیصلہ صادر کریں، وہ ایک الگ معاملہ ہوگا۔ لیکن قاری کے فیصلے کو مدنظر رکھا جائے تو اردو ادب کو مقبول اور ثروت مند بنانے میں ابن صفی کا حصہ بلاشبہ اہم ترین مانا جائے گا۔'' (صفحہ:99)

ڈاکٹر خالد جاوید

(ادیب، ناول نگار، ریٹائرڈ پروفیسر، شعبہ اردو، JMI، نئی دہلی)

''عمران کی حماقت دراصل معصومیت، اخلاق، بہادری، بےجگری، فرض شناسی، استقلال، ملال اور افسردگی کا ایک عجیب وغریب مجموعہ اضداد ہے۔ یہ ابن صفی کا قطعی منفرد، انوکھا اور بے حد معنی خیز کردار ہے جس کی مکمل تفہیم یا تشریح بہت مشکل ہے۔ دراصل ابن صفی نے عمران کے کردار کی تخلیق کر کے یونانی المیوں اور طربیوں دونوں کے 'ہیرو' کے مفروضے کو اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ کرنل فریدی کا کردار تو 'ہیرو' کے روایتی تصور سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے مگر عمران کے کردار میں 'اینٹی ہیرو' ہونے کے تمام عناصر اور امکانات موجود ہیں۔'' (صفحہ:608-609)

ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی (مفکر، نقاد، ادیب، دانشور)

''ابن صفی نے صرف جاسوسی کے موضوع پر ہی قلم نہیں اٹھایا ہے بلکہ ان کے رشحاتِ قلم میں سماجی یا معاشرتی موضوعات بھی ہیں۔ 'پرنس چلّی' سماج سے بغاوت اور انسان کے دوغلے پن کی داستان ہے۔ 'تزک دو پیازی' ابن صفی کی ناول نگاری اور کردار سازی کا نقطہ عروج ہے۔ اگر ابن صفی کے کُل جاسوسی سرمائے سے صرف نظر کر لیا جائے

توبھی یہ 'تزک دو پیازی' عہد وسطیٰ کی زندگی اور انسان کی توہم پرستی کا ایک زندہ نمونہ ہے، جس میں قدم قدم پر اسرار، تنوع اور تحیّر کی دنیا آباد ہے۔'' (صفحہ:625)

پروفیسر اختر الواسع (سابق ڈائرکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

''میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے شعور کی تربیت میں ابن صفی کا جو کردار ہے وہ کسی دوسرے مصنف کے حصہ میں نہیں آیا۔ زندگی کے بے شمار قرینے اور خاص طور پر سماجی زندگی جینے کا ہنر ابن صفی ہی نے دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ابن صفی کی مقصدیت فن میں اس طرح تحلیل ہے کہ اسے آسانی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے ناولوں میں زندگی کے نہ صرف مختلف رنگ بلکہ مشاہدے اور تجربے کے ایسے ایسے رنگ اور واقعات ہیں کہ اس کے بیان کے لیے بھی ایک دفتر درکار ہے۔'' (صفحہ:483)

لئیق رضوی (ٹیلی ویژن میڈیا کوآرڈی نیٹر، نوئیڈا)

''جاسوسی ناول نگاری، دو دھاری تلوار پر چلنے کا نام ہے۔ قلم کی ذراسی لغزش جرم اور مجرم کو گلیمرائز کرسکتی ہے، لیکن ابن صفی نے اس کٹھن ڈگر پر بھی قدم قدم پر اپنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ خیالی کہانیوں کو انھوں نے اس فنکاری سے بُنا اور بیان کیا ہے کہ ان میں حقیقت کے رنگ بھی جھلکتے ہیں۔ یہ کہانیاں فطری اور منطقی طور پر اپنے انجام تک پہنچتی ہیں۔ ان کے وِلن بھی اجنبی نہیں ہیں۔ ابن صفی نے انہیں اس طرح اُبھارا ہے کہ یہ عموماً اپنے ہی اِرد گرد کے بھٹکے ہوئے لوگ محسوس ہوتے ہیں۔'' (صفحہ: 411)

ڈاکٹر عبدالحیؒ (اسسٹنٹ پروفیسر، پی جی شعبہ اردو، گیا کالج، بہار)

''ابن صفی نے اپنے ذاتی تجربوں، مشاہدوں اور مطالعے سے اپنی تحریروں میں اعلیٰ درجے کی ظرافت پیش کی ہے۔ اس ظرافت میں وہ کبھی بھی اپنے مقصد سے نہیں ہٹے۔ قانون کا پاس ولحاظ، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، خواتین کی عزت، ملک اور مذہب کی پاسداری اُن کا نصب العین تھا۔ وہ برصغیر کے ہی نہیں اپنے پورے عہد میں اردو کے تمام ادیبوں میں ایک انفرادی شناخت رکھتے ہیں۔'' (صفحہ:446)

شمیم طارق (ممبئی کے سینئر صحافی، ادیب، محقق)

''گزشتہ تیس چالیس برسوں میں ابن صفی کی تحریریں ڈائجسٹوں اور رسالوں میں reproduce ہوتی رہی ہیں۔ چوری چھپے کچھ جعلی ایڈیشن بھی شائع ہوئے ہیں مگر جس شان سے یہ ناول شائع ہونا چاہیے تھے، نہیں ہوئے ہیں۔ ان پر کچھ لکھا بھی نہیں گیا ہے۔ پرانے ایڈیشن نایاب ہیں یا اتنی بُری حالت میں ہیں کہ ان کو ہاتھ لگاتے ہی صفحات برادہ بن جاتے ہیں۔ عارف اقبال صاحب نے ان کو سنبھالنے اور دوبارہ شائع کرنے کا حوصلہ دکھا کر اردو والوں کا 'ادبی فرض کفایہ' ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔'' (صفحہ:117)

محمد عارف اقبال (ایڈیٹر، اردو بک ریویو، نئی دہلی)

''اردو دنیا میں ابن صفی کی خدمات کو یکسر نظر انداز کردیا جانا محض اتفاق نہیں ہے بلکہ اس کی پشت پر بڑی سوچی سمجھی اسکیم کارفرما رہی ہے۔ اندازہ کیجیے کہ منفرد لب ولہجہ کا ادیب وشاعر اردو دنیا کے قارئین کے دلوں پر 'حکومت' کرتا ہو اور اسی دنیا سے وابستہ چند ادیب ونقاد ابن صفی کی خدمات کے سلسلے میں اندھے، بہرے اور گونگے بن گئے ہوں، کیا یہ بات حلق سے نیچے اُتر سکتی ہے؟'' (صفحہ:471)

ادارتی نوٹ

خراجِ عقیدت کے طور پر تمام اقتباسات 'ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ' (دوسرا ایڈیشن 2016) مؤلف ومرتب: محمد عارف اقبال۔ تمام مذکورہ منتخب اقتباسات اس کتاب میں شامل مضامین سے لیے گئے ہیں۔ ہر اقتباس کے نیچے صفحہ نمبر درج ہے۔ (مدیر) ❑❑❑

کیوں کر عینک کو نہ آنکھوں سے لگاؤں اے یار

از: احمد حاطب صدیقی (ابونثر)

ایک شُستہ اور شائستہ خاتون پوچھتی ہیں:

''عام بول چال میں جو ہم بولتے ہیں کہ 'وہ عین وقت پر آ گیا' اور بچوں کے جو نام رکھے جاتے ہیں 'قرۃ العین' یا 'نورالعین' تو اِن سب میں 'عین' کا کیا مطلب ہے؟ اور اس کا حرف 'ع' سے کیا تعلق ہے؟''

'عین' کے متعلق یہ سوال پڑھ کر ہم تو غین ہو گئے۔ 'غین ہو جانا' جدید بول چال کا کلمہ ہے۔ قدیم لغات میں نہیں ملے گا۔ اس کا مطلب ہے بیٹھے بیٹھے غائب غُلّا ہو جانا یا ہوش و حواس کھو بیٹھنا۔ شان الحق حقی مرحوم نے اپنے 'فرہنگِ تلفظ' میں 'غین' کا مطلب 'غوطہ' اور 'غافل' بھی لکھا ہے۔ یعنی 'غین ہو جانا' غوطہ کھا جانے اور غافل ہو جانے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اتنی کیفیات میں بیک وقت مبتلا ہو جانے کا باعث یہ ہے کہ اس سوال کا جواب آسان نہیں ہے۔ مختصر بھی نہیں ہے۔ لہٰذا اس کالم میں 'عین' کے تمام مفاہیم کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا کرنے کی ہم کوشش بھی نہیں کریں گے۔

چلیے سب سے پہلے حرف 'ع' ہی کو لے لیجے۔ صاحبِ فرہنگِ آصفیہ مولوی سید احمد دہلوی مرحوم لکھتے ہیں:

''عربی کا اٹھارہواں، فارسی کا اکیسواں اور اُردو کا چوبیسواں حرف جسے عین مہملہ یا غیر منقوطہ کہتے ہیں [غیر منقوطہ کا مطلب ہے بغیر نقطے والا] اس کا تلفظ اہل عرب سے بہتر کوئی نہیں نکال سکتا، اس کی آواز کنٹھ کے نیچے سے نکلتی ہے۔''

'کنٹھ' گلے، حلق یا ٹینٹوے کو کہتے ہیں۔ آسان الفاظ میں یوں سمجھ لیجے کہ اہلِ عرب 'ع' کا تلفظ حلق کے اُس حصے سے کرتے ہیں جہاں سے اہلِ عجم صرف قے کیا کرتے ہیں۔

مولوی صاحب مرحوم کی معلومات پرانی ہو گئی ہیں۔ 'ع' اب اُردو حروفِ تہجی کا چوبیسواں حرف نہیں رہا۔ اُردو نے مولوی صاحب کے وفات پا جانے کے بعد خاصی ترقی کی ہے۔ کچھ مزید حروف تہجی اپنے ذخیرۂ حروف میں شامل کر لیے ہیں، کچھ الفاظ بدل لیے ہیں اور کچھ مفاہیم میں بھی تبدیلی لائی گئی ہے۔ بھاری آوازوں کو حروفِ تہجی کا درجہ دے دینے کے بعد اب اُردو حروفِ تہجی کی مجموعی تعداد چوّن ہو گئی ہے۔ مقتدرہ قومی زبان، پاکستان کی جاری کردہ معیاری تختی کے مطابق 'ع' اب اُردو حروفِ تہجی کا پینتیسواں حرف ہے۔ اکیلے اِس حرفِ 'ع' کے استعمالات بھی کئی عدد ہیں۔ قرآنِ مجید میں 'ع' رکوع مکمل ہونے کا اشارہ ہے۔ 'علیہ السلام' کے مخفف کے طور پر بھی 'ع' لکھا جاتا ہے، مثلاً حضرت آدمؑ۔ علاوہ ازیں یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ آگے مصرع آ رہا ہے، اشارتاً 'ع' لکھ دیتے ہیں۔

محترمہ شائستہ نے جو آخری سوال کیا ہے، اُس کا ہم پہلے جواب دیے دیتے ہیں کہ لفظ 'عین' کا حرف 'ع' سے بس اتنا تعلق ہے کہ ہم 'ع' سے 'عین' لکھتے ہیں۔ ٹی وی والوں کا بس چلے تو الف سے لکھ ماریں۔ 'ع' سے لکھنے پر ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ہمارے عزیز دوست اختر عباس جو بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں، حتیٰ کہ 'الف انار' اور 'ب بلّی' بھی پڑھے ہوئے ہیں، اس بات پر سخت تعجب کا اظہار کیا کرتے تھے کہ یہ علامہ اقبالؔ کی اُردو کو کیا ہو گیا تھا کہ انھوں نے 'ع لڑائی' لکھا؟ یہاں 'ل' کی آواز تو صاف نکل رہی ہے۔ چناں چہ اقبالؔ کی اصلاح کر کے وہ اس مصرعے کو یوں پڑھا کرتے تھے:

آ گیا 'لام لڑائی' میں اگر وقتِ نماز

یوں بھی 'لام' کا لڑائی سے گہرا تعلق ہے۔ 'لام' کا مطلب فوج یا پلٹن ہے اور 'لام بندی' کا مطلب ہے لڑائی کے لیے لشکر

جمع کرنا۔

اب ہم عین اپنے موضوع پر آتے ہیں۔عربی زبان میں تو ’عین‘ کے سو سے زائد معانی ہیں۔گو کہ اکثر لغت نویسوں نے ’عین‘ کے صرف پچاس معانی لکھے ہیں۔ پچاس معانی لکھ کر ہی وہ تھک گئے اور چھک گئے۔ہم تو خیر پچاس بھی نہیں لکھ سکتے، اس سے پہلے ہی چھک جائیں گے۔ پھر بھی ’عین‘ کے کچھ ایسے معانی یہاں لکھے دیتے ہیں جو ہمارے ہاں زیادہ معروف نہیں ہیں، مثلاً: سپہ سالار، جاسوس یا مخبر، شعاعِ آفتاب، اہلِ شہر، اہلِ خانہ، بڑا اور معزز آدمی، ترازو کا جھکاؤ، مسافت میں قریب، مطلوبہ سمت، نقد مال، سرسبز ہونا اور پہرے دار یا نگراں، وغیرہ وغیرہ۔نہر کو بھی عربی میں ’عین‘ کہا جاتا ہے۔ہم اُردو میں ملکہ زبیدہ کی کھنچوائی ہوئی نہر کو ’نہرِ زبیدہ‘ کہتے ہیں، یہ سوچ کر کہ ’نہر‘ عربی کا لفظ ہے، جس کے معنی دریا کے بھی ہیں، لیکن عرب مصر ہیں ’نہرِ زبیدہ‘ کو بھی ’عینِ زبیدہ‘ کہنے پر۔ چلیے صاحب کہہ لیجے۔

یہ تو تھے غیر معروف معانی۔معروف معنوں میں سے ’عین‘ کا ایک مطلب آنکھ یا چشم ہے۔ دوسرا مطلب ’چشمہ‘۔ وہ چشمہ جو پہاڑوں اور پتھروں سے پھوٹ نکلتا ہے۔ سورۃ الغاشیہ کی بارہویں آیت میں جنت کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اُس میں "عَیْنٌ جَارِیَۃٌ" یعنی بہتا ہوا چشمہ ہوگا۔ آنکھ سے بہنے والا آنسو یا کنویں اور چشمے سے اُبلنے والا پانی ’مَعِیْن‘ کہلاتا ہے اور ’عین‘ کی جمع ’عیون‘ ہے۔

رہا وہ چشمہ جو ناک پر بیٹھ کر دونوں کان پکڑ لیتا ہے، اُس کو بھی ہم عین سے ’عینک‘ کہتے ہیں۔ہم ہی نہیں، ذوقؔ بھی کہا کرتے تھے:

کیوں کر عینک کو نہ آنکھوں سے لگاؤں اے یار
چار آنکھیں ہوئیں تجھ قوتِ بینائی سے

’عینک‘ میں جو ’عین‘ ہے اُس کا مطلب آنکھ ہے۔ ذوقؔ کے شعر سے آپ کے علم میں کم از کم اتنا اضافہ تو ہو چکا ہوگا کہ عینک آنکھوں ہی سے لگائی جاتی ہے۔ جب کہ بعض لوگ اسے سر بھی چڑھا لیتے ہیں۔چشمِ سر ہی کو ’عین‘ کہتے ہیں اور پلک جھپکنے کو ’طرفۃ العین‘۔نظرِ بد بھی ’عین‘ ہوتی ہے کہ جو اچھی چیز کو بُری نظر سے دیکھنے پر لگ جاتی ہے۔جو شے آنکھوں دیکھی ہو وہ ’عینی‘ ہوتی ہے۔ ہماری عدالتوں میں کبھی پیشہ ور اور کبھی حقیقی نوعیت کے ’عینی شاہدین‘ پیش کیے جاتے ہیں، جو عدالت میں حاضر ہو کر ’عینی شہادت‘ پیش کرتے ہیں۔ جب کسی چیز کو آنکھ سے دیکھنے کے بعد ہی یقین آئے تو ایسے یقین کو ’عین الیقین‘ کہا جاتا ہے۔ذوقؔ کا یقین بھی کچھ ایسا ہی ہوگا، عین ممکن ہے:

نہ چھوڑے گی جیتا مجھے چشمِ قاتل
یقیں ہے، یقیں، بلکہ عین الیقیں ہے

قرۃ العین اور نور العین میں بھی ’عین‘ کا مطلب آنکھ ہے۔ قرۃ العین آنکھ کی ٹھنڈک۔نور العین آنکھ کا نور، جسے نورِ چشم بھی کہتے ہیں۔

اب آئیے ’عین‘ کے کچھ مزید معنوں کی طرف۔ہر چیز کی ذات، حقیقت یا جوہر کو ’عین‘ کہا جاتا ہے۔اس مفہوم میں ’عین‘ اُردو میں بکثرت استعمال ہوتا ہے۔مثلاً: ’’عین نوازش ہوگی‘‘... ’’عین فجر کے وقت دھما کا ہوا‘‘... ’’عین احسان ہوگا اگر آپ عید سے قبل میری رقم ادا کر دیں‘‘ وغیرہ وغیرہ۔اخترؔ (شاہِ اودھ) کا شعر ہے:

جس امر میں ہو خوشی تمہاری
میری بھی وہی ہے عین مرضی

’عین وقت‘ یا ’عین فجر کے وقت‘ جیسے جملوں میں ’عین‘ کا مطلب بالکل ٹھیک وقت، بروقت اور معین وقت لیا جائے گا۔

دو چیزیں یا دو افراد بالکل مشابہ ہوں تو انھیں ’عین غین‘ کہتے ہیں یعنی دونوں میں کوئی فرق نہیں، بس نقطے برابر فرق ہوگا۔ ہو بہو کے معنوں میں ’عین مین‘ بھی بولتے ہیں، جیسے: ’’یہ تو عین مین ویسا ہی بکرا ہے جیسا ہم پچھلی عید پر لائے تھے۔‘‘

ایسے بکرے کے لیے آپ ’عین مین‘ کی جگہ ’بعینہٖ‘ یا ’عین غین‘ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہہ کر دیکھ لیجے کہ بِدک کر سینگ تو نہیں مارتا۔

کل عید ہے، سو، اس کالم کے تمام قارئین کو ’ع‘ سے عید الاضحیٰ مبارک ہو۔ اگر یہ کالم عین عید کے روز شائع ہوتا تو کیا خوب ہوتا۔

[بشکریہ فرائیڈے اسپیشل، کراچی۔6 جون 2025]

❑❑❑

پروفیسر شہاب الدین ثاقب (علی گڑھ)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر کے عہدے سے ریٹائرڈ (2022) پروفیسر شہاب الدین ثاقب تقریباً 34 برسوں کا تدریسی تجربہ رکھتے ہیں۔ تحقیق، میر شناسی، غیر افسانوی نثر ان کے خصوص مطالعے اور دلچسپی کے میدان ہیں۔ تحقیق و تنقید کے ساتھ شاعری سے بھی لگاؤ رکھتے ہیں۔ شہاب الدین ثاقب نے 1974 میں بہار سیکنڈری بورڈ پٹنہ سے ہائی اسکول اور 1976 میں بہار یونیورسٹی مظفر پور سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انہوں نے 1979 میں بی اے آنرز اور 1981 میں ایم اے (اردو) کے امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ 1984 میں مولوی عبدالحق کی ادبی ولسانی خدمات کے موضوع پر ایم فل اور انجمن ترقی اردو (ہند) کی علمی اور ادبی خدمات کے موضوع پر 1986 میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ لسانیات میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما اور ترکی زبان میں ڈپلوما کے امتحانات بھی انہوں نے مسلم یونیورسٹی سے بالترتیب 1980 اور 1984 میں پاس کیے۔ 2003 میں ایم اے (فارسی) کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن حاصل کرنے پر انہیں عمر خیام گولڈ میڈل اور یونیورسٹی میڈل سے نوازا گیا۔

مصحفی کے تذکرہ 'عقد ثریا' کی تدوین پر شہاب الدین ثاقب کو فارسی میں بھی پی ایچ۔ڈی کی سند حاصل ہوئی۔ اب تک ان کے ساٹھ مقالات و مضامین ملک و بیرون ملک کے مقتدر رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ چالیس قومی و بین الاقوامی سمیناروں میں اپنے مقالے پیش کر چکے ہیں۔ ان کی نگرانی میں 19 ریسرچ اسکالرز نے ایم فل / پی ایچ۔ڈی مکمل کی ہے۔ ان کی دس سے زائد علمی و تحقیقی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ علاوہ ازیں تین شعری مجموعے حرف امتحاں (1988)، شہر میرے خواب کا (2009) اور نئے پیرہن کا شوق (2021) بھی شائع ہوئے۔ یوپی، بہار اور مغربی بنگال کی اردو اکادمیوں سے ان کی متعدد کتابوں پر انعامات مل چکے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں یوپی اردو اکادمی نے انہیں 2019 میں 'مسعود حسن رضوی انعام برائے تحقیق' سے نوازا تھا۔

اہم تصانیف: • فارسی ادب میں محمد تقی میر کی خدمات • میر کا دیوان سوم و چہارم • انداز نظر • عقد ثریا: تذکرۂ فارسی گویان • نقد و جستجو

● آپ کی تاریخ پیدائش؟

■ **15 فروری 1957ء** مقام: رانی پور، ضلع سیوان (بہار)

● آپ نے کس اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی؟

■ پرائمری اردو مکتب، رانی پور / جی ایم ہائی اسکول بڑہریا

● آپ کی مادری زبان اور ذریعہ تعلیم؟

■ اردو

● آپ کے مطالعہ کے موضوعات کیا ہیں؟

■ تحقیق و تنقید، غیر افسانوی نثر، میریات

● اِس وقت کون سی کتاب آپ کے زیر مطالعہ ہے؟

■ دیوانِ میر (فارسی)

● آپ کے پسندیدہ مصنّفین (ادیب، ناول و افسانہ نگار، شاعر وغیرہ) کون ہیں؟

■ رشید احمد صدیقی، قاضی عبدالستار، طارق چھتاری، سیّد محمد اشرف، غالب، اقبال

● آپ کی زندگی میں کس کتاب سے انقلابی تبدیلی رونما ہوئی؟

■ قرآن مجید / مکتوبات صدی

● حصولِ تعلیم کے دوران میں آپ کو کس نصابی کتاب نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟

■ فردوس بریں / مثنوی سحر البیان / بانگ درا

● آپ اردو کا کون سا اخبار / رسالہ خریدتے ہیں؟

■ انقلاب، فکر و تحقیق، اردو دنیا، اردو ادب، آجکل، امروز، اردو بک ریویو، ایوان اردو، معارف وغیرہ

● آپ کے گھر کے نوجوان (teen agers) کیا اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں اور اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں؟

■ ماشاءاللہ سبھی اردو کی تعلیم سے بہرہ مند ہیں

● آپ کے نزدیک سیکولر تعلیم کا کیا مفہوم ہے؟

■ ایسی تعلیم جو ملک کے نوجوانوں کو ہر قسم کے تعصب، تنگ نظری، احساسِ تفاخر اور عدم رواداری سے پاک رکھے

● علم و ادب کے میدان میں نئی نسل کے تعلیمی و علمی رجحان کو آپ کس زاویہ سے دیکھتے ہیں؟

■ نئی نسل کو پیشہ ورانہ تعلیم کے ساتھ شعر و ادب کے مطالعہ، اخلاقیات، تربت نفس، نظم و ضبط، پابندئ وقت، کھیل کود اور ورزش پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ موبائل کی خرافات سے احتراز بے حد ضروری ہے

● کیا آپ اپنے ملک کی تعلیمی ترقی سے مطمئن ہیں؟

■ بالکل نہیں، کیونکہ نئی نسل کو حسب ضرورت تعلیمی وسائل اور معیاری تعلیم کی سہولتیں بہت کم میسر ہیں...

● ملک میں اردو کی بنیادی اور حقیقی ترقی کے اہم نکات کیا ہو سکتے ہیں؟ کیا اردو کی ترقی کے لیے اردو کو روزگار سے جوڑنا ناگزیر ہے؟

■ کسی بھی زبان کی ترقی کے لیے صرف روزگار سے جوڑنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ عوام کے دلوں میں زبان سے محبت اور فروغ دینے کا جذبہ ہونا چاہیے

● ملک کی اردو اکادمیوں اور اداروں کے ترقیاتی منصوبوں سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

■ زیادہ تر اکادمیاں اور ادارے، جلسے، سمینار، کانفرنس وغیرہ پر اپنا سارا زور صرف کر دیتی ہیں...

● وہ کون سی کتاب ہے جسے آپ بار بار پڑھنا چاہتے ہیں؟

■ قرآن مجید۔ خطباتِ مدراس۔ گردِ راہ

● **مکمل پتہ:** D-2 4/4، مسکن، شمشاد مارکیٹ، قلعہ روڈ، علی گڑھ-202002 موبائل: 6396407595
E-mail: shahabuddinsaqib@rediffmail.com

پروفیسر مجید بیدار (حیدرآباد)

معروف ادیب، محقق اور نقاد پروفیسر مجید بیدار (خاندانی نام سیّد عبدالمجید) ولد سیّد عبدالعزیز (مرحوم) نے جامعہ عثمانیہ سے 1975 میں ایم اے (امتیازی حیثیت سے) پاس کیا۔ 1977 میں ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد انہیں پونا یونیورسٹی سے پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری بھی تفویض کی گئی۔ اسی برس وہ پونا کالج میں جونیئر لکچرر کی حیثیت سے فائز ہوئے۔ اس کے بعد 1978 میں مولانا آزاد کالج، اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں سینئر لکچرر مقرر ہوئے۔ 1997 میں جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد میں ریڈر اور 2004 میں پروفیسر ہوئے۔ 2010 میں جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبہ اردو مقرر ہوئے اور جون 2018 میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی اور شموگہ کی یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے۔ ان دنوں موصوف وایانا یونیورسٹی، کریم نگر میں ایڈجنکٹ پروفیسر کی حیثیت سے کارگزار ہیں۔ ان کی نگرانی میں 25 سے زائد ریسرچ اسکالرز نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور 12 طلبا نے ایم فل کیا۔ انہیں جنوبی ہند کی پانچ یونیورسٹیز میں ریسرچ گائڈ کا درجہ حاصل ہے۔ ان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے جنوبی ہند کی 24 یونیورسٹیز کے بی اے اور ایم اے کے نصابات ترتیب دیے۔

پروفیسر مجید بیدار کا تدریسی تجربہ کم و بیش 40 برسوں کو محیط ہے۔ تحقیق و تنقید ہی نہیں بلکہ بچوں کے ادب پر بھی ان کی تخلیقات منظر عام پر آتی رہی ہیں۔ 24 کتابوں کے مصنف پروفیسر مجید بیدار کے 600 سے زائد تحقیقی مقالات ملک کے نامور رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ انہوں نے 300 سے زائد کتابوں پر تبصرے بھی لکھے ہیں۔ انہیں مختلف اردو اداروں اور اکیڈمیز نے اعزازات و انعامات سے بھی سرفراز کیا ہے۔ ضعف اور علالت کے باوجود اردو میں ان کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہے۔ 'داستانِ دکن' کے عنوان سے 18 ایپی سوڈز پر مشتمل پروفیسر مجید بیدار یوٹیوب پر موجود ہیں۔ پروفیسر مجید بیدار سر سیّد کالج آف آرٹس، سائنس اینڈ کامرس، اورنگ آباد کے بنیاد گزاروں میں شامل ہیں۔

اہم تصانیف: ● دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی ادبی خدمات (1979) ● ناول اور متعلقات ناول (1982) ● دکنی نثر پر ایک نظر (2007) ● اردو کی شعری و نثری اصناف (2017) ● اردو زبان و ادب کی تاریخ (2018) ● اردو مضمون نگاری (2023)

● آپ کی تاریخ پیدائش؟

■ 16 مئی 1952ء مقام: تعلقہ پرگی، ضلع حیدرآباد (تلنگانہ)

● آپ نے کس اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی؟

■ دبیر پورہ پرائمری اسکول اردو میڈیم (صغیر تا سوم)

● آپ کی مادری زبان اور ذریعہ تعلیم؟

■ اردو۔ اردو

● آپ کے مطالعہ کے موضوعات کیا ہیں؟

■ فکشن، ڈراما، تاریخ، تحقیق و تنقید

● اِس وقت کون سی کتاب آپ کے زیر مطالعہ ہے؟

■ دکن میں اسلامی علوم کی تاریخ

● آپ کے پسندیدہ مصنّفین (ادیب، ناول و افسانہ نگار، شاعر وغیرہ) کون ہیں؟

■ محمد مجیب، ڈاکٹر زور، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، شکیل بدایونی، مجروح، جگر مرادآبادی، مخدوم

● آپ کی زندگی میں کس کتاب سے انقلابی تبدیلی رونما ہوئی؟

■ دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا اور اعجاز القرآن

● حصولِ تعلیم کے دوران میں آپ کو کس نصابی کتاب نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟

■ شفیع الدین نیر کی شاعری کے علاوہ اجنتا اردو ریڈر، نشانِ راہ اردو ریڈر

● آپ اردو کا کون سا اخبار/ رسالہ خریدتے ہیں؟

■ شہر اورنگ آباد کا اورنگ آباد ٹائمز، حیدرآباد میں 'سیاست' اور 'منصف'

● آپ کے گھر کے نوجوان (teen agers) کیا اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں اور اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں؟

■ تمام بیٹیاں اور افراد خاندان کی مادری زبان اردو ہے اور لکھنے پڑھنے میں استعمال کرتے ہیں

● آپ کے نزدیک سیکولر تعلیم کا کیا مفہوم ہے؟

■ اخلاق اور تربیت سے وابستگی

● علم و ادب کے میدان میں نئی نسل کے تعلیمی و علمی رجحان کو آپ کس زاویہ سے دیکھتے ہیں؟

■ معلومات ادھوری اور محنت و جستجو سے عاری

● کیا آپ اپنے ملک کی تعلیمی ترقی سے مطمئن ہیں؟

■ ملک کی تعلیمی ترقی کے معیار سے جنوبی ہند کے تعلیمی معیار سے مطمئن (اردو ذریعہ تعلیم کی ترقی کے نتیجے میں)

● ملک میں اردو کی بنیادی اور حقیقی ترقی کے اہم نکات کیا ہو سکتے ہیں؟ کیا اردو کی ترقی کے لیے اردو کو روزگار سے جوڑنا ناگزیر ہے؟

■ اردو داں طبقہ میں مطالعہ کا شعور اور آگاہی کے علاوہ معلومات سے بھرپور کتابوں کی فراہمی

● ملک کی اردو اکادمیوں اور اداروں کے ترقیاتی منصوبوں سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

■ مرکزی ادارہ اور دہلی اور یوپی اردو اکادمی کے علاوہ دیگر اکیڈمی اور اردو اداروں کے منصوبے غیر اطمینان بخش

● وہ کون سی کتاب ہے جسے آپ بار بار پڑھنا چاہتے ہیں؟

■ ہر قسم کی تحقیق سے آراستہ جامع کتاب

● **مکمل پتہ:** تعاون ابوڈ، راگھوا کالونی، ٹولی چوکی، حیدرآباد-500008 (تلنگانہ) Mobile: 9441697072

E-mail: majeedbedar@gmail.com

ریاض احمد قادری (وارانسی)

ریاض احمد قادری ولد علامہ عزیز الحق کوثر ندوی کی ولادت بنارس کے ایک علمی وروحانی خانوادے میں ہوئی۔ ریاض احمد قادری نے اردو، ہندی اور ریاضی کی تعلیم کے ساتھ سات سال کی عمر میں قرآن مجید مکمل کرلیا۔ 1973 میں محض 14 سال کی عمر میں ختم بخاری کے بعد سند فضیلت حاصل کی۔ بنارس ہندو یونیورسٹی میں بی اے (آنرز) اور ایم اے (عربی لٹریچر) امتیازی نمبر سے پاس کیا۔ جنوری 1993 میں یو جی سی (نیشنل لیول ٹسٹ) کے ماسٹر لیول کے امتحان میں کامیابی حاصل کرکے یونیورسٹی میں لکچررشپ کی اہلیت کی سند حاصل کی۔ ایم اے کے بعد بنارس ہندو یونیورسٹی میں پی ایچ۔ ڈی کے لیے بھی رجسٹریشن ہوگیا اور تھیسس پر کام بھی جاری تھا۔ ان کی تحقیق کا عنوان تھا: **العلامة الزمخشری احواله و آثاره** (علامہ زمخشری کے حالات اور ان کی علمی خدمات)۔ دریں اثنا والد گرامی کے انتقال (18 مارچ 1993) کے بعد خانگی مصروفیات کے سبب تھیسس کا کام بھی ادھورا رہ گیا۔ 2013 میں حج کمیٹی آف انڈیا نے ان کو پورے اتر پردیش کے لیے ماسٹر ٹرینر نامزد کردیا۔ ریاض احمد قادری نے اپنے والد گرمی کے یادگار مرحوم ماہنامہ 'تعلیمات' کا دوبارہ اگست 1995 میں 'تعلیمات جدید' کے نام سے اجرا کیا۔ اشاعت وادارت کی ذمہ داری خود سنبھالی۔ 9 سال تک رسالہ شائع ہوتا رہا لیکن مسلسل نقصان کی بنا پر بالآخر بند کرنا پڑا۔ 2010 میں ان کو بنارس کے ایک اسلامی ادارہ دائرۃ الاصلاح کے شعبۂ عالیہ میں تدریس کے لیے مدعو کیا گیا، وہاں 12 سال تک حدیث وفقہ، نحو وصرف اور عربی ادب و بلاغت کی تدریس کا فریضہ انجام دینے کے بعد 2022 میں وہ سبکدوش ہوگئے۔ ریاض احمد قادری کو چار بار حرمین شریفین کے مقدس سفر کی سعادت ملی۔ سفرنامہ حجاز کے علاوہ چند ادبی، درسی اور اصلاحی کتابیں بھی ان کی مرتب ہوچکی ہیں۔ ماہنامہ 'تعلیمات جدید' کے اداریوں کا مجموعہ ہے۔ ریاض احمد قادری کا شمار 'اردو بک ریویو' کے قدیم قارئین میں ہوتا ہے۔ اردو زبان وادب سے بے پناہ شغف ہے۔ مختلف النوع موضوعات پر کتابوں کے مطالعہ کا ذوق کے ساتھ ہی علمی وادبی تجزیہ میں مہارت حاصل ہے۔

اہم تصانیف: ● شرح 'دروس البلاغۃ' ● ترجمہ 'اطواق الذہب' للزمخشری ● مرکز عقیدت پر حاضری (سفرنامہ) ● سفر حجاز (سفرنامہ) ● تحفۃ الحجاج ● حج وعمرہ کا آسان طریقہ ● چہل حدیث مع ترجمہ وتشریح

● آپ کی تاریخ پیدائش؟

■ **10 نومبر 1959** ء مقام: محلّہ پچی باغ، ضلع بنارس (یوپی)

● آپ نے کس اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی؟

■ جامعہ عربیہ ضیاء العلوم، وارانسی

● آپ کی مادری زبان اور ذریعہ تعلیم؟

■ اردو

● آپ کے مطالعہ کے موضوعات کیا ہیں؟

■ اسلامیات، اردو ادب، عربی ادب

● اِس وقت کون سی کتاب آپ کے زیر مطالعہ ہے؟

■ تدبر قرآن (امین احسن)، جواہر البیان فی تفسیر القرآن (کوثر ندوی)

● آپ کے پسندیدہ مصنّفین (ادیب، ناول وافسانہ نگار، شاعر وغیرہ) کون ہیں؟

■ علامہ شبلی نعمانی، مولانا مودودی، ڈپٹی نذیر احمد، کرشن چندر، ڈاکٹر اقبال

● آپ کی زندگی میں کس کتاب سے انقلابی تبدیلی رونما ہوئی؟

■ فی ظلال القرآن، الجہاد فی الاسلام

● حصولِ تعلیم کے دوران میں آپ کو کس نصابی کتاب نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟

■ تفسیر کشاف، سنن ترمذی، الفقہ علی المذاہب الاربعۃ

● آپ اردو کا کون سا اخبار/ رسالہ خریدتے ہیں؟

■ انقلاب، تعمیر حیات، معارف، مجلہ علوم القرآن

● آپ کے گھر کے نوجوان (teen agers) کیا اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں اور اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں؟

■ گھر کے سارے بچے (بچیاں) پہلے مدرسہ میں بذریعہ اردو میڈیم تعلیم حاصل کرتے ہیں اور سبھی اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں

● آپ کے نزدیک سیکولر تعلیم کا کیا مفہوم ہے؟

■ ایسا نصاب ونظامِ تعلیم جو باہمی اتحاد میں معاون ہو اور نفرت وعداوت کا حامی نہ ہو

● علم وادب کے میدان میں نئی نسل کے تعلیمی وعلمی رجحان کو آپ کس زاویہ سے دیکھتے ہیں؟

■ ہر قسم کی سہولیات کے باوجود مطالعہ کا ذوق کم ہوتا جارہا ہے، اس کی ایک اہم وجہ سوشل میڈیا پر حد درجہ انحصار ہے

● کیا آپ اپنے ملک کی تعلیمی ترقی سے مطمئن ہیں؟

■ موجودہ تعلیمی بیداری قابل تحسین ہے لیکن اطمینان بخش نہیں۔۔۔

● ملک میں اردو کی بنیادی اور حقیقی ترقی کے اہم نکات کیا ہوسکتے ہیں؟ کیا اردو کی ترقی کے لیے اردو کو روزگار سے جوڑنا ناگزیر ہے؟

■ ہم اعلیٰ درجہ کا نصاب بنائیں اور پرائمری تعلیم اسی نصاب کے مطابق جاری کریں

● ملک کی اردو اکادمیوں اور اداروں کے ترقیاتی منصوبوں سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

■ اردو اکیڈمی کی کارکردگی غیر اطمینان بخش ہے

● وہ کون سی کتاب ہے جسے آپ بار بار پڑھنا چاہتے ہیں؟

■ قرآن حکیم، مثنوی مولانا روم، کلیات اقبال، مثنوی صحیفۂ زندگی (کوثر ندویؒ)

● **مکمل پتہ:** J-31/78، پچی باغ، وارانسی-221001
Mobile: 7905661199 - 9839878316

شکیل اعجاز (اکولہ، مہاراشٹر)

اردو زبان وادب کے استاد، ادیب، مزاح نگار اور مصور شکیل اعجاز ولد عبدالغنی اردو کے ساتھ فارسی میں بھی ایم اے ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر اخلاق اثر (بھوپال) کی سر پرستی میں ریجنل کالج آف ایجوکیشن، بھوپال سے بی ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ مزاح نگاری سے خاص دلچسپی کے سبب ان کا پہلا مضمون 'لیٹر پیڈ' ماہنامہ شگوفہ، حیدرآباد میں شائع ہوا۔ کم وبیش 40 برس سے شگوفہ میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ممبئی کے روزنامے 'اردو ٹائمز' اور 'انقلاب' میں بھی مضامین شائع ہوئے۔ اب ممبئی اردو نیوز میں بھی ان کی تخلیقات شائع ہو رہی ہیں۔ شکیل اعجاز کو بچپن سے مصوری، موسیقی اور کتب بینی کا ذوق رہا ہے۔ میٹرک کے بعد ہی انہوں نے برہانپور (مدھیہ پردیش) کے اشرف اسٹوڈیو میں تین سال تک فلمی بینرس (Banners) بنائے اور سیوا سدن کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ بھوپال سے بی ایڈ کرنے کے بعد ہی شکیل اعجاز نے جنتا ہائی اسکول بارسی ٹاکلی میں بحیثیت استاد ملازمت کا آغاز کر دیا تھا۔ 2012 میں جونیئر کالج (بارسی ٹاکلی) سے باضابطہ سبکدوش ہوئے۔ ان کے اسکیچز اور چند مضامین ہفت روزہ 'بلٹز' ممبئی میں شائع ہوئے۔ ممبئی میں فلم اور ادب سے منسلک کئی اہم شخصیات سے ان کی خط وکتابت اور ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں دلیپ کمار، نوشاد، دیو آنند، ساحر لدھیانوی، خواجہ احمد عباس، ڈاکٹر ظ انصاری، ندا فاضلی وغیرہ شامل ہیں۔ تیس سے زائد کتابوں کے مرتب ومصنف شکیل اعجاز کے مضامین کے ترجمے ہندی، انگلش اور مراٹھی میں بھی ہوئے۔ 1990 کی دہائی میں شکیل اعجاز کا لکھا انشائیہ 'لیٹر پیڈ' مہاراشٹر بورڈ آف سیکنڈری اینڈ ہائر سیکنڈری ایجوکیشن (پونے) کی بارہویں جماعت کی نصابی کتاب میں تقریباً دس تک شامل رہا۔ ان سے لیے گئے کئی انٹرویوز یوٹیوب پر دستیاب ہیں۔ انہوں نے دوڈوکومینٹری فلم بھی بنائی تھی۔ شکیل اعجاز کو ان کی ادبی خدمات اور مزاح نگاری (1990 تا 2023) کے لیے کئی ایوارڈز و اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب 'ظ: ایک شخص تھا' (از ندیم صدیقی، ممبئی) کا اسکیچ بھی شکیل اعجاز کے فن کا نمونہ ہے۔

اہم تصانیف: ● دراصل (مزاحیہ مضامین) ● چھٹی حس (مزاحیہ مضامین) ● تری قربت کے لمحے (مزاحیہ ناول) ● پڑھنے کے بعد (چند کتابوں پر ادبی مضامین) ● پڑھتے پڑھتے مسکرانا (مزاحیہ مضامین) ● بچوں کا ادب پڑھنا ● بچوں کی شکیل کہانیاں

● آپ کی تاریخ پیدائش؟

■ 2 جولائی 1954ء مقام: اکولہ، مہاراشٹر

● آپ نے کس اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی؟

■ اکولہ کی میونسپل پرائمری اسکول نمبر ۳ میں

● آپ کی مادری زبان اور ذریعہ تعلیم؟

■ مادری زبان اردو۔ ذریعہ تعلیم بھی زیادہ تر اردو۔ بعد میں ہندی اور انگریزی

● آپ کے مطالعہ کے موضوعات کیا ہیں؟

■ مزاحیہ ادب، شاعری، ابن صفی کے ناول وغیرہ

● اِس وقت کون سی کتاب آپ کے زیر مطالعہ ہے؟

■ ندیم صدیقی کی کتاب ''پُرسہ''

● آپ کے پسندیدہ مصنّفین (ادیب، ناول وافسانہ نگار، شاعر وغیرہ) کون ہیں؟

■ کرشند چندر، شفیق الرحمٰن، مشتاق احمد یوسفی، پروین شاکر، مظفر حنفی

● آپ کی زندگی میں کس کتاب سے انقلابی تبدیلی رونما ہوئی؟

■ کسی ایک کتاب کا نام لکھنا مشکل ہے

● حصولِ تعلیم کے دوران میں آپ کو کس نصابی کتاب نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟

■ مولانا ابوالکلام آزاد کی ''قولِ فیصل''

● آپ اردو کا کون سا اخبار/ رسالہ خریدتے ہیں؟

■ انقلاب (ممبئی)، حیدرآباد کا رسالہ شگوفہ اور اردو بک ریویو، نئی دہلی

● آپ کے گھر کے نوجوان (teen agers) کیا اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں اور اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں؟

■ جی ہاں۔ بچے اردو لکھنا پڑھنا اچھی طرح جانتے ہیں اور اردو ہی کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں

● آپ کے نزدیک سیکولر تعلیم کا کیا مفہوم ہے؟

■ ہندوستان میں جہاں کئی مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں سیکولر تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ ہر مذہب کے ماننے والے اپنے مذہب پر آسانی سے چل سکیں اور ساتھ ہی دوسرے مذاہب والوں کا احترام کریں

● علم وادب کے میدان میں نئی نسل کے تعلیمی وعلمی رجحان کو آپ کس زاویہ سے دیکھتے ہیں؟

■ موبائل کے سبب نئی نسل کے بیشتر نوجوان کتابوں سے فاصلہ بنائے ہوئے ہیں اسی وجہ سے اردو ادب کی کتابیں اب کم خریدی جاتی ہیں۔۔۔

● کیا آپ اپنے ملک کی تعلیمی ترقی سے مطمئن ہیں؟

■ جی ہاں مطمئن ہوں، اگرچہ کہ مزید توجہ کی ضرورت ہے

● ملک میں اردو کی بنیادی اور حقیقی ترقی کے اہم نکات کیا ہو سکتے ہیں؟ کیا اردو کی ترقی کے لیے اردو کو روزگار سے جوڑنا ناگزیر ہے؟

■ ملک میں اردو کی بنیادی اور حقیقی ترقی کے لیے اردو کو روزگار سے جوڑنا بہت ضروری ہے

● ملک کی اردو اکادمیوں اور اداروں کے ترقیاتی منصوبوں سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

■ اردو اکادمیوں اور اداروں کے دَم سے ادبی سطح پر چہل پہل تو رہتی ہے۔ حکومت کے ذریعے چلنے والے اداروں، اکادمیوں میں سرکاری ملازمین کا عمل دخل جتنا کم ہو اتنا اچھا ہے۔ وقفہ وقفہ سے طریقۂ کار میں سدھار لانا ضروری ہے

● وہ کون سی کتاب ہے جسے آپ بار بار پڑھنا چاہتے ہیں؟

■ قرآن مجید

● **مکمل پتہ:** نزد مسجد مومن پورہ، اکولہ-444001 (مہاراشٹر)
Mobile: 7219319382

سیر حاصل

سرِ بازارمی رقصم (آپ بیتی)

از: محمد عارف اقبال

سرِ بازارمی رقصم (آپ بیتی)
مصنف: پروفیسر محمد حسن
صفحات: 420، قیمت: -/750، اشاعت: 2024
ISBN 978-81-969274-8-6
ناشر: نامک پبلی کیشنز، اوکھلا، نئی دہلی-110025
Mobile: 7428107305 - 7428042155
Email: info@naamakpublications.com

معروف محقق، ادیب اور نقاد پروفیسر محمد حسن (یکم جولائی 1926 – 24 اپریل 2010) اتر پردیش کے معروف صنعتی شہر مرادآباد کے محلّہ نواب پورہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ان کے والد حاجی الطاف حسن نے مدرسہ میں دلوائی۔ پھر میٹرک (1939)، انٹرمیڈیٹ (1942) کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے 1944 میں بی اے کی ڈگری لی۔ وہیں سے انہوں نے اردو میں ایم اے (1946) اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ 1952 میں انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ سے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کی نگرانی میں پی ایچ – ڈی کی تکمیل کی۔ ان کی تحقیق کا موضوع تھا: 'اردو ادب شاہانِ اودھ کے دور میں'۔ اس مختصر تعلیمی تفصیلات کے بعد اگر ہم پروفیسر محمد حسن کی تدریسی، ادبی، علمی، تحقیقی اور تخلیقی خدمات کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی 74 سالہ حیات میں انہوں نے اتنے کارہائے نمایاں انجام دیے کہ شاید ان کو ہر دو چار گھنٹے میں چند گہری سانسیں ضرور لینی پڑتی ہوں گی۔ ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے پروفیسر محمد حسن کے انتقال کے بعد کسی خاص نمبر (ادبی مجلہ) کے لیے ایک 'سوانحی کوائف' تیار کیا تھا۔

آٹھ صفحات پر مشتمل یہ 'سوانحی کوائف' بھی اس 'آپ بیتی' کی زینت ہے۔ اس پر ایک نظر ڈالتے ہی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ 1942 سے 2010 کے دوران میں پروفیسر محمد حسن نے سیاست سے صحافت تک اور تخلیق سے تحقیق تک کا جو سفر طے کیا وہ نہ صرف سنسنی خیز ہے بلکہ معرکہ آرا بھی ہے۔ شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی سے بطور لکچرر (1952) انہوں نے تدریسی پیشہ اختیار کیا، پھر دہلی یونیورسٹی (1963) ہوتے ہوئے کشمیر یونیورسٹی (شعبۂ اردو) میں پروفیسر (1971) ہوئے۔ بالآخر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے 9 دسمبر 1990 کو سبکدوش ہوئے۔ جواہر لعل نہرو شپ کے دوران ان کو یوروپی ممالک کے سفر (1973 تا 1975) کا موقع ملا۔ انہوں نے برطانیہ، جرمنی، فرانس، اٹلی اور سوئٹزر لینڈ کے کتب خانوں سے راست استفادہ کیا۔ نیز انہوں نے پاکستان، لبنان، نیویارک، کناڈا اور روس کے اسفار بھی کیے۔ اس درمیان میں انہوں نے شاعری کی، ناول لکھے، ڈرامے تیار کیے، ترجمے کیے اور تصنیف کے ساتھ ترتیب و تدوین کی خدمات بھی انجام دیں۔ انہوں نے ڈاکٹر یعقوب یاور کے ایک اہم ناول 'دل مُن' کا ہندی میں ترجمہ کیا تھا اور دیباچہ بھی لکھا تھا جسے راج کمل پرکاشن دہلی نے شائع کیا تھا۔ ان کی کتابیں اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی میں بھی ہیں۔ وہ گیارہ سال تک 'انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند' کے صدر بھی رہے۔ ادبی، تخلیقی اور تحقیقی خدمات کے صلے میں پروفیسر

تبصرے کے لیے اپنی کتاب کے دو نسخے ارسال فرمائیں۔ ایک نسخہ موصول ہونے پر تبصرہ شائع نہیں ہوگا۔ (ادارہ)

محمد حسن کو کئی بڑے اعزازات و انعامات سے سرفراز کیا گیا جن میں غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے 'ہم سب غالب ڈرامہ ایوارڈ' اردو اکادمی دہلی کی جانب سے ایوارڈ برائے تحقیق و تنقید شامل ہیں۔ اسی طرح اردو اکادمی دہلی کی جانب سے 1999 میں 'کُل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ' بھی عطا کیا گیا۔ مہاراشٹر کا اعلیٰ ترین ایوارڈ بھی دیا گیا۔

پروفیسر محمد حسن کا یہ مختصر تعارف محض اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی شخصیت کے تعمیری اور تخلیقی پہلوؤں کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ واضح ہو کہ اس وقت پروفیسر محمد حسن کے درجنوں شاگرد ہیں جو اردو زبان و ادب کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

پروفیسر محمد حسن کی شخصیت کے اس روشن علمی و ادبی پس منظر میں ان کی آپ بیتی 'سر بازار می رقصم' کا مطالعہ اور تجزیہ شاید کسی حد تک آسان ہو جائے۔ اس کتاب کے سرورق پر اس کے ناشر نے ایک عبارت درج کی ہے ''ہندوستانی تاریخ اور اردو دنیا کے چشم کشا حقائق اور ہوشِ ربا واقعات پر مشتمل''۔ اس آپ بیتی کے بارے میں یہ بات عیاں ہے کہ اس کی اشاعت اس جہانِ فانی سے مصنف کے رخصت ہو جانے کے کئی برسوں بعد ہوئی ہے۔ ایک افواہ یہ بھی گردش میں تھی کہ پاکستان میں اس کی اشاعت کئی سال پہلے ہو چکی ہے، اس کے بعد بھارت میں ہوئی۔ تاہم اس کی تصدیق خود اس کے ناشر نے کی کہ بھارتی ایڈیشن سے تقریباً چھ ماہ قبل پاکستان میں اس کی اشاعت ہوئی تھی۔ یہ 'آپ بیتی' چونکہ 2024 کے اواخر میں شائع ہوئی اور قارئین تک پہنچنے لگی تو اس کے مطالعے سے مصنف کے چند شاگردوں نے اس کے بعض قابل اعتراض بہ الفاظ دیگر فحش مواد کے سبب اسے 'جعلی' قرار دیا۔ گویا وہ اپنے استاد محترم سے اس کی توقع ہرگز نہیں رکھتے کہ وہ اپنی 'آپ بیتی' میں فحش نگاری کے مرتکب ہو سکتے تھے۔ خوش گمانی اچھی چیز ہے اور اپنے استاد کو اس کا شاگرد یقینی طور پر زیادہ بہتر طور پر جان سکتا ہے۔

استاد کی ادبی میراث کے محافظ یہ شاگرد شاید اب بھی شک و ریب کی کیفیت میں مبتلا ہیں جبکہ کتاب کی اشاعت کے بعد ممبئی کے اشعر نجمی صاحب نے اپنے ادبی مجلہ 'اثبات' میں چٹخارے لے کر اس کتاب کے اس باب کی اشاعت کا اعلان کیا ہے، جو طویل عرصے کے بعد اردو ادب کی دنیا میں کسی اردو اسکالر، محقق اور محترم استاد کے قلم سے صفحہ قرطاس کی زینت بنا ہے۔ اشعر نجمی صاحب کا مقصد کیا ہے، اس کا اندازہ کسی حد تک ان کے فیس بک پوسٹ سے ہوتا ہے۔ لیکن ان کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کہ محمد حسن کی یہ خودنوشت پاکستان میں دو سال قبل شائع ہوئی تھی۔ ان کی یہ بات بھی محل نظر ہے کہ ہندوستانی ایڈیشن میں تقریباً چالیس پچاس صفحات ایڈٹ / حذف کر کے چھاپے گئے ہیں۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ ہندوستانی ایڈیشن میں چند خواتین کے نام کا 'مخفف' استعمال کیا گیا ہے اور ایسا کرنا پبلشر کی مصلحت یا حکمت ہو سکتی ہے۔ اس سے آپ بیتی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس موقع پر ایک نکتہ یہ بھی قابل غور ہے کہ پروفیسر محمد حسن کی بیوہ روشن آرا بیگم ابھی حیات سے ہیں۔ ان کے دو بیٹے جاوید حسن امریکہ میں ہیں اور چھوٹا بیٹا نوید حسن دبئی میں۔ بیٹی ڈاکٹر ثمینہ حسن کی شادی، انور صدیقی سے ہوئی ہے جو دہلی میں اسسٹنٹ پولیس کمشنر ہیں۔ خود ڈاکٹر ثمینہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں تاریخ کی استاد ہیں۔ نامک پبلی کیشنز نے اس کتاب کی اشاعت یوں ہی نہیں کی ہوگی۔ اگر کسی 'جعلی مسودے' کی اشاعت کی جاتی تو سب سے پہلے ڈاکٹر ثمینہ کو سخت اعتراض ہوتا۔ لیکن ان کی طرف سے کسی منفی ردعمل کی اطلاع تا حال راقم تک نہیں پہنچی ہے۔ اطلاعاً یہ بھی عرض ہے کہ کتاب کی پہلی اشاعت ختم ہونے کے بعد 2025 میں اس کی دوسری اشاعت (reprint) منظر عام پر آئی ہے۔ اس لیے یہ ماننے میں کوئی قباحت نہیں کہ پروفیسر محمد حسن نے اپنی 'آپ بیتی' کی اشاعت منصوبہ بند طریقے سے اپنی حیات ہی میں کی تھی۔ تاہم ان کی خود یہ خواہش ہوگی کہ ان کے انتقال کے کتنے سال بعد اس 'آپ بیتی' کی اشاعت کی جائے۔ لہٰذا یہ بات طے ہے کہ یہ 'آپ بیتی' اصل ہے نہ کہ 'جعلی'۔

'سر بازار می رقصم' (آپ بیتی) دس بڑے عنوانات اور ابواب پر مشتمل ہے۔ 'منکہ محمد حسن' آپ بیتی کا پہلا عنوان ہے۔ یہ مکمل آپ بیتی ہے جو 'نقوش' لاہور کے آپ بیتی نمبر، جون 1964 میں چھپا تھا۔ اس کے بعد کے 'ابواب' اس طرح ہیں: یہ خلد

بریں ارمانوں کی (صفحہ 45)، سربازارمی رقصم (صفحہ 99)، دلّی سے پہلی ملاقات (صفحہ 149)، رخت ِ دِل کاشمیر کشا (صفحہ 211)، گری کلاہ ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے (صفحہ 243)، پرتو حسن خیال ہے (صفحہ 277)، بہے چنیں عیشے چناں (صفحہ 311)، دل پھر طواف کوے ملامت کو جائے ہے (صفحہ 325)، زخم تمنا کی بہار (صفحہ 365)، شکست شیشۂ دل کی صدا کیا (صفحہ 405، صرف ایک صفحہ ناتمام کہانی)۔

'ایک اور پناہ گاہ' اس آپ بیتی کا پہلا صفحہ ہے جس میں محمد حسن نے اپنا اعترافیہ بیان یوں درج کیا ہے:

''اس داستان کو لکھتے وقت اندازہ ہوا کہ میری شخصیت کی پہچان ایک شدید وحشت اور خلجان ہے جس سے نجات پانے کے لیے میں ہر دور میں اور ہر وقت خود کو مختلف سرگرمیوں یا ادبی مشغلوں میں مصروف رکھتا آیا ہوں۔ گویا یہ سب میری مختلف پناہ گاہیں رہی ہیں، ڈراما ہو یا تنقید، شاعری، افسانہ نگاری، ناول نگاری، سیاسی سرگرمیاں ہوں یا مطالعہ— یہ سب واماندگیٔ شوق کی پناہ گاہیں رہی ہیں۔ اور جب ان سے جی بھر گیا یا یہ اور زیادہ پناہ نہ دے سکیں تو دوسرے سہاروں کی طرف چلا گیا۔ گویا عمر بھر کی بے نام بے قراری اور مسلسل پناہ گیری کی تلاش ہے۔...''

پروفیسر محمد حسن نے اگرچہ زمینداروں کے گھرانے میں جنم لیا اور عیش وعشرت میں ان کی پرورش ہوئی لیکن ان کا باغیانہ مزاج پرانے طرز معاشرت سے سمجھوتہ نہیں کرسکا۔ حتیٰ کہ ماں کی مامتا اور والدین کے لاڈ پیار سے ان کو شدید نفرت ہوگئی۔ گھر کا ماحول روایتی تھا اس کے باوجود وہ اپنے گھر میں باقاعدہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے پہلے فرد تھے۔ وہ اسکول جاتے تب بھی ان پر ایک ملازم بڑے میاں مسلط ہوتے۔ بچپن کے کھیلوں سے محرومی کے سبب وہ نہایت جھینپو، شرمیلے اور خلوت پسند ہوکر رہ گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ بچپن ہی سے ایک ایسی نفسیاتی پیچیدگی کے شکار رہے جس کا نام خود محمد حسن کو نہیں معلوم تھا۔ البتہ مطالعہ اور اخبار بینی کی طرف راغب ہوگئے گویا ذہنی الجھنوں (complexes) کی یہ ان کی پہلی 'پناہ گاہ' تھی۔ محمد حسن لڑکپن میں گھریلو ماحول کے سبب نماز روزے کی طرف مائل تھے۔ روزہ کبھی قضا نہیں کرتے۔ اسی زمانے میں چند کمیونسٹ افراد سے ملاقات اور پھر دوستی کے سبب ان میں اسلامی یا مذہبی حدود سے بغاوت کے عناصر اس طرح داخل ہوئے کہ ان کی ذہنی کیفیت تشکیک سے ہوتی ہوتی الحاد تک پہنچ گئی۔ ماہنامہ 'نگار' جو بے دینی کی علامت تصور کیا جاتا تھا، محمد حسن اس کا مطالعہ پابندی سے کرتے تھے۔ اس کے مطالعے نے محمد حسن میں آزاد خیالی اور تشکیک کے رجحان کو تقویت پہنچائی۔ مطالعہ کے شوق میں اور انگریزی زبان سے اچھی واقفیت کے سبب اسی زمانے میں محمد حسن نے فرانسیسی ناولوں کا مطالعہ شروع کردیا۔ ابراہام اسٹون کے ناول Lust of Life (زندگی کی ہوس) سے ان کے جذبات قابو میں نہ رہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ ''آرٹ سے لگاؤ تھا، صرف ایک عدد محبوبہ کی کمی تھی۔'' (صفحہ 23)

محمد حسن لکھتے ہیں کہ ان کی جنسی واقفیت وقت سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ گو وہ عملی نہیں محض نظریاتی تھی۔ اس واقفیت کی بنیاد وہ کتاب بنی تھی جو Studies in Psychology of Sex کے نام سے ان کو مرادآباد کی میونسپل لائبریری میں ملی تھی۔ ہیولاک ایلس (Havelock Eliss) جو لندن میں ایک معالج (Physician) تھا، اس کتاب کو لکھ کر اس نے یوروپ کے معاشرے میں بھی ہیجان برپا کردیا تھا۔ یہ کتاب 6 ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، اس کی پہلی جلد ہی منظر عام پر آئی تھی کہ اس پر مقدمہ قائم ہوگیا۔ بالآخر لندن میں اس کتاب کی مزید اشاعت روک دی گئی۔ ہیولاک ایلس (2 فروری 1858— 3 جولائی 1939) نے اپنی کتاب کی دیگر جلدیں امریکہ میں شائع کرائیں (1897 تا 1910 کے درمیان)۔ آپ تصور کیجیے کہ ہندوستان کے مقابلے میں اس زمانے کا یوروپی معاشرہ بھی آزاد خیالی کے باوجود اس کتاب کی اشاعت کو برداشت نہیں کرسکا۔ اس میں جنسی رجحان وجذبات (Sexual Behaviour) اور Homo Sexuality کے بارے میں بیباکی سے اظہار خیال کیا گیا ہے نیز معاشرے میں جنسی تعلیم کی ضرورت کو ناگزیر قرار دیا گیا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں محمد حسن لکھتے ہیں کہ انہوں نے اس کی تمام جلدوں کا سلسلہ وار مطالعہ کیا تھا۔

انہوں نے لکھا ہے کہ ان کے دلچسپ ضمیمے جن میں مختلف لوگوں کے انٹرویو اور جوابات بھی شامل تھے، اس سے لذت تو خیر ملتی ہی تھی، معلومات بھی حاصل ہوتی تھی۔ (صفحہ 365)

'سر بازار می رقصم' ایک ایسی آپ بیتی ہے جس پر ان دنوں اس کے باب 10 پر ہی خاص طور سے اظہار خیال کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ پروفیسر محمد حسن نے اپنی آپ بیتی میں اپنی حیات کی ایسی جزیات نگاری کی ہے کہ اس سے قبل شاید ہی کوئی آپ بیتی اس نہج کی لکھی گئی ہو۔ کسی آپ بیتی میں اپنی خوبیوں کو نمک مرچ لگا کر بیان کرنا آسان ہے، لیکن کمزوریوں کی نشاندہی کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں۔ اس آپ بیتی کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے ہر باب کے لیے حواشی تحریر کیے ہیں، ان حواشی سے ایک عہد کی ادبی، تعلیمی، سماجی اور سیاسی تاریخ کا اندازہ ہوتا ہے۔ جن شخصیات سے بالخصوص محمد حسن کے روابط رہے، یا جن سے ملاقات ہوئی، ان کے بارے میں کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ ان میں پروفیسر آل احمد سرور، علی سردار جعفری، اسرارالحق مجاز، احتشام حسین، ساحر لدھیانوی، رشید احمد صدیقی، عصمت چغتائی، نیاز حیدر، باقر مہدی، قمر رئیس، پروفیسر نورالحسن ہاشمی، عرفان حبیب، کرنل بشیر زیدی، ستیش چندر (تاریخ داں)، خلیق احمد نظامی، ڈاکٹر ذاکر حسین، عبدالبصیر خاں، کمال احمد صدیقی، احمد جمال پاشا، قاضی عبدالستار، گوپی چند نارنگ، شیخ محمد عبداللہ، سر ضیاء الدین زبیری، قاضی عبدالودود، مجنوں گورکھپوری، خورشیدالاسلام، مونس رضا، علی یاور جنگ، خواجہ احمد عباس، بدرالدین طیب جی، سرراس مسعود، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد فاروقی، مجروح سلطانپوری، حامد حسن قادری، رفعت سروش، گیان چند جین، مرزا محمود بیگ، پروفیسر نامور سنگھ، ذکی انور، رالف رسل، کلدیپ نیر غرض اتنی شخصیات ہیں کہ یہاں درج کرنا مشکل ہے۔ ان میں چند تاریخی شخصیات بھی ہیں۔ محمد حسن نے کئی سماجی، سیاسی، دینی جماعتوں کا بھی حواشی میں تفصیلی ذکر کیا ہے۔

پروفیسر محمد حسن لکھنؤ سے اکتوبر 1954 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آ گئے تھے۔ محمد حسن کو علی گڑھ بہت پسند تھا (صفحہ 51)۔ باب 'یہ خلد بریں ارمانوں کی' اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تمام 'خیر و شر' کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ باب 'سر بازار می رقصم' کا آغاز ہی اس جملے سے کیا گیا ہے کہ ''علی گڑھ آتے ہی سوائے دل کی مسلسل بے قراری کے باقی سبھی نعمتیں میسر تھیں'' (صفحہ 99)۔ کیونکہ مصنف کو آل احمد سرور اور عبدالعلیم صاحب کی خصوصی توجہ اور ذاکر حسین صاحب کی ہمدردی سے علی گڑھ میں امان مل گئی تھی۔ 1957 میں محمد حسن نے اردو کی ایم اے کلاس سے رفیقہ سفر چننے کا فیصلہ کیا تھا۔ روشن آرا بیگم مین پوری (یوپی) کی رہنے والی تھی۔ شادی کے دن برات کے ساتھ مین پوری جانے والوں میں سرور صاحب، مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر نذیر احمد بھی شامل تھے۔ محمد حسن لکھتے ہیں کہ شادی سے قبل ہی ان کے ریڈیو ڈراموں کی شہرت تھی۔ پاکستان سے دو کتابیں 'زلفیں زنجیریں' (ناول) اور جلال لکھنوی پر تحقیقی مقالہ شائع ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں 'ادبی تنقید' اور 'اردو ادب میں رومانوی تحریک' کے نام سے دو تنقیدی کتابیں چھپ چکی تھیں۔ 'ہندی ادب کی تاریخ' اور ڈراموں کا مجموعہ چھپ رہے تھے۔ اس طرح ان کا نام ادبی دنیا میں اپنی شناخت منوا چکا تھا (صفحہ 101)۔ اس صفحہ پر محمد حسن یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''اب سوچتا ہوں تو میری زندگی کا آخری نقطہ عروج تھا، اس کے بعد کا دور صرف اس کا خمیازہ:

جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا''

ایم اے اردو کی طالبہ روشن آرا بیگم سے پروفیسر محمد حسن کی شادی کیسی تھی اس کے احوال کا کسی حد تک درست اندازہ صرف اس 'آپ بیتی' کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ سہاگ رات کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

''رات خاصی بے لطفی سے کٹی اور اس پہلی ملاقات میں یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ روشن صرف ڈگری لینے کے لیے اردو میں ایم اے کر رہی ہیں، انہیں ادب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، یہ میرے لیے بڑا صدمہ تھا۔'' (صفحہ 102)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''دھیرے دھیرے نوبت سامان کے نقصان اور کپڑے اور ضروری کاغذ پھاڑ ڈالنے اور گریباں چاک کرنے تک پہنچی۔ گریباں بھی اپنا نہیں میرا۔ آنے والوں سے بھی تلخ

گفتاری شروع ہوگئی اور ان کے جانے کے بعد خود مجھ سے گھنٹوں تکرار رہنے لگی۔'' (صفحہ 103)

کسی مہذب ادیب وشاعر اور یونیورسٹی پروفیسر کے لیے یہ بات کس قدر صدمے کی ہوسکتی ہے کہ جو طالبہ اس کی شاگردہ بھی ہو، اس کے ساتھ بدتمیزی کی تمام حدیں پار کردے۔ اس سے کہیں زیادہ بدتر حالات بعد میں پیدا ہوئے جب روشن آرا کی ماں بھی اپنی بیٹی کے ساتھ رہنے کو آ گئیں۔ یہاں تک کہ'خلوت' اور'جلوت' کا فرق ہی مِٹ گیا۔ کتاب کے ہر باب کا مطالعہ کرجائیے۔ شادی کے بعد کے حالات اس قدر بدتر اور ناگفتہ بہ ہوگئے کہ محمد حسن کے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں۔لیکن محمد حسن کی قوت برداشت دیکھیے کہ اپنی حیات تک تقریباً 53 سال انہوں نے روشن آرا بیگم کی تمام تلخیوں کو برداشت کیا۔ گرمی کی چھٹی گزارنے وہ اپنی بیوی کے ساتھ پہلی بار کشمیر گئے۔ وہاں کا ایک منظر ملاحظہ کریں:

''وہاں لال چوک کے قریب ہی ایک ہوٹل میں ٹھہرے، یہاں بھی روزانہ کے لڑائی جھگڑوں کی یہی صورت رہی، کبھی ہوٹل کی کرسی ٹوٹی، کبھی فرش پر ضرب آئی، کبھی کپڑے اور کاغذ پھٹے۔ کبھی گلاس اور برتن ٹوٹے۔ ہم لوگوں نے پہلی عید انہی حالات میں وہاں منائی۔'' (صفحہ 104)

ڈاکٹر محمد حسن نے کئی جگہوں پر اپنی جنسی ناآسودگی اور محرومی کا ذکر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ (اردو) افسانے میں ہزار خوبیاں ہیں مگر ایک خرابی بھی ہے کہ ان میں جنسیات کا غلبہ ہے۔ (صفحہ 327)

ڈاکٹر محمد حسن نے اپنی'آپ بیتی' میں بالخصوص شخصیات کے حوالے سے اتنے حقائق پیش کیے ہیں کہ اگر وہ نہیں لکھتے تو یہ باتیں شاید مخفی ہی رہتیں۔ انہوں نے بعض شخصیات کی ذہنی کجروی، منفی رجحانات اور رویے سے بھی پردہ اٹھایا ہے، اگرچہ علمی وادبی لحاظ سے ان کا قد کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو۔ محمد حسن نے اپنی آپ بیتی لکھنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے حواشی لکھ کر انہوں نے اپنی معلومات کے دریا بہا دیے ہیں۔لیکن مطالعے کے دوران اگر صرف کتاب کے آخری باب پر نظر رکھی جائے گی تو شاید قاری کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا۔

مولوی عبدالحق سے کراچی میں اپنی ملاقات اور گفتگو بیان کرتے ہوئے محمد حسن نے مولوی عبدالحق کا یہ جملہ خاص طور سے لکھا ہے:

''اردو کا مستقبل ہے تو ہندوستان ہی میں ہے۔'' (صفحہ 72)

کتاب سے چند مزید اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''ذاکر حسین ان رہنماؤں میں سے تھے جنہوں نے آزاد ہندوستان میں روشن خیالی، جمہوریت اور سیکولرزم کے فروغ کے لیے قربانیاں دیں۔'' (صفحہ 140)

''انہوں نے (ذاکر حسین صاحب) انجمن ترقی اردو کے صدر کی حیثیت سے صدر جمہوریہ راجندر پرساد کو اردو کے فروغ کے لیے ڈھائی لاکھ دستخطوں کے ساتھ ایک میمورنڈم پیش کیا تھا۔ 1954 میں ذاکر صاحب بہار کے گورنر، 1962 میں نائب صدر جمہوریہ اور 1967 میں اندرا گاندھی کی وزارت عظمیٰ میں صدر جمہوریہ کے عہدے تک پہنچے۔'' (صفحہ 141-140)

''علامہ اقبال نے کہا تھا کہ'راس مسعود نے دل دادا کا اور دماغ باپ کا پایا ہے'۔ انگریزی راج میں یونیورسٹی میں جواہر لعل نہرو کو بطور مقرر مدعو کرنا ان کا کارنامہ تھا۔'' (صفحہ 146)

''شہوانیات کا ادھورا اور چوری چھپے والا جو نسخہ مجھے ملا وہ نیاز فتح پوری کی کتاب'شہوانیات' کے ذریعے ملا تھا پھر ...''
(صفحہ 326)

''خواجہ احمد فاروقی کے لیے ہندوستان میں اردو کی بقا کا سوال سیکولرزم اور مشترکہ ہندو، مسلم کلچر کی بقا سے وابستہ تھا۔''
(صفحہ 193)

''1947 میں جب دہلی میں انجمن ترقی اردو کے دفتر میں آگ لگائی گئی اور دو کارکنوں کو قتل کیا گیا تو ہاشمی صاحب (نورالحسن ہاشمی) کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ بھی نذر آتش ہوگیا۔''
(صفحہ 194)

''راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (RSS) کی سیاسی شاخ کے طور پر شیاما پرساد مکھرجی نے 1951 میں بھارتیہ جن سنگھ قائم کی تھی۔ اس کی فکر کانگریس کے سیکولرزم کے برخلاف ہندتو کے مذہبی وثقافتی نظریہ پر قائم ہے۔'' (صفحہ 197)

''... جب ملک میں ایمرجنسی کا دور دورہ ہوا تو مسعود حسین

خاں کوحکومت کے اداروں میں خوب خوب ابھارا گیا۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ وہ ایمرجنسی کے حمایتی اردو مصنّفین کے قائم کردہ ادارے کے صدر مقرر کیے گئے اور نارنگ کنویز بنے۔'' (صفحہ 314)

''حکیم عبدالحمید ملک میں سیکولرزم کے فروغ کے لیے ہر لمحہ کوشاں رہتے تھے اور گاندھی جی کے نظریہ ہندوستانی زبان کے پیروکار تھے۔'' (صفحہ 402)

''6 دسمبر 1992 کو اجودھیا میں فرقہ پرستوں اور حکومت کے اشتراک سے جب بابری مسجد شہید کی گئی تو حکیم عبدالحمید ایک مایوس اور شکست خوردہ انسان بن کررہ گئے تھے۔''

(صفحہ 403-402)

''... سرور صاحب اب وائس چانسلر (کرنل بشیر حسین زیدی) سے بہت قریب تھے اور محسوس کررہے تھے کہ علی گڑھ کے اصل حکمراں وہی ہیں۔'' (صفحہ 117)

''رشید صاحب (رشید احمد صدیقی) کی عادت تھی کہ ان کے پاس جو کتابیں اور مسودے پیش لفظ یا تعارف لکھوانے کے لیے آتے تھے ان کے پیش لفظ وہ خود نہ لکھتے تھے بلکہ نیازمندوں میں سے جو سامنے آگیا اس کے سپرد کردیا کرتے تھے۔'' (صفحہ 130)

''ذکی انور 1929 میں بہار شریف میں پیدا ہوئے۔ ترقی پسند اور ہندو—مسلم اتحاد کے پیروکار تھے۔ کریم سٹی کالج، جمشید پور کے صدر شعبہ اردو رہے۔ ... مشترکہ ہندو—مسلم کلچر پر اعتماد تھا اور اپنے ادیب ہونے کا شدید احساس۔ فسادیوں نے رام نومی کے دن اپریل 1979 میں ان کی جان اور اعتماد دونوں کو مٹادیا۔'' (صفحہ 209)

ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے چھوٹے بھائی اقبال کو تعلیم دلانے کی غرض سے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ لیکن تلخ ازدواجی زندگی نے ان کا جینا حرام کردیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ شادی کے بعد گھر بار کی اور خاص طور پر مرادآباد کے لوگوں کی ذراسی مدد کرنا دشوار ہوگیا اور گھر پر سسرال والوں کا راج ہوگیا۔ اور وہ اس طرح کہ اس گھر میں میرے لیے کوئی گوشہ عافیت نہ رہا۔ (صفحہ 112)

اس 'آپ بیتی' کے مطالعہ سے ایک حیرت انگیز بات یہ معلوم ہوئی کہ ڈاکٹر محمد حسن کی ازدواجی زندگی اول روز سے تلخیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ان کی محترمہ کا سلوک بعض اوقات انتہائی ناروا ہوتا تھا۔ لیکن پروفیسر صاحب اپنی بیوی کو اپنی موت تک ڈھوتے رہے، اس کے نازنخرے حتیٰ کہ تشدد برداشت کرتے رہے لیکن لب پر 'طلاق' کا لفظ نہیں آیا۔ ساری زندگی جہاں وہ علم وادب کے میدان میں فعال اور متحرک رہے وہیں اپنی محترمہ کی تمام تر بداعمالیوں کے باوجود ازدواجی زندگی کو گوارا کرتے رہے۔

اس آپ بیتی کا ایک باب 'زخم تمنا کی بہار' عام طور پر اپنے قاری کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ شاید اسی باب کی وجہ سے ماہنامہ پیش رفت، نئی دہلی کے مدیر ڈاکٹر حسن رضا نے اپریل 2025 کے شمارے کے اداریہ کا عنوان رکھا ہے 'آپ بیتی اور اس کی اخلاقیات'۔ یہ اداریہ عام قاری کے لیے اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اچھا ہے۔ انہوں نے اپنی بات کو مستحکم کرنے کے لیے کئی مثال دیگر آپ بیتیوں کے حوالے سے بھی دی ہیں۔ پروفیسر محمد حسن کی آپ بیتی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر حسن رضا نے بجا طور سے لکھا ہے کہ''... ڈاکٹر محمد حسن کی آپ بیتی 'سر بازار می رقصم' ... جس کا آخری باب 'زخم تمنا کی بہار' ہے، جس میں انہوں نے اپنی جنسی بے راہ روی کو بڑی بے حیائی اور انتہائی بے شرمی کے ساتھ مزے لے لے کر بیان کیا ہے، حالانکہ اس کا عنوان ثم ردونہ اسفل سافلین رکھنا چاہیے تھا۔ اس سے اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ محمد حسن صرف بے خدا آدمی نہیں تھے بلکہ جس قدر بھی پڑھے لکھے ہوں اور جتنا بھی بظاہر کامیاب نظر آئیں، وہ بے چارے عمر بھر کی بے نام بے قراری اور مسلسل پناہ گیری کی تلاش میں جنسی آوارگی اور عصمت دری میں مبتلا رہے۔''

ڈاکٹر حسن رضا صاحب نے اس باب کے مطالعے سے جو کچھ سمجھا، اپنی رائے دی دی ہے۔ وہ اس کا حق بھی رکھتے ہیں۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے محمد حسن کے اصل مسئلہ یا مرض کو شاید جاننے کی کوشش نہیں کی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنا معتبر و مستند محقق و نقاد جس کی شرافت کی گواہی اس کے درجنوں شاگرد آج بھی دیتے ہیں، آخر کیا وجہ ہے کہ اپنی عمر کے آخری حصے میں اپنی 'آپ بیتی' میں آخری باب 'زخم تمنا کی بہار' کا اضافہ کرتا۔ محمد حسن کی اس 'فحش نگاری' کا ایک پہلو یہ بھی ہوسکتا ہے

کہ وہ ہزاروں سفید پوش دانشور اور اسکالرز کی قلعی کھولنا چاہتے ہوں جو اپنی 'کرتوتوں' کو سینے میں مخفی رکھتے ہوئے مرجاتے ہیں۔ اور دنیا ان کی ادبی وتخلیقی خدمات کا ڈنکا پیٹتی رہتی ہے۔ محمد حسن نے خود علی سردار جعفری جیسے معتبر شاعر کو 'قابل اعتراض' حالت میں دیکھا ہے۔

تاہم اس سے الگ جو بات محمد حسن کی آپ بیتی میں نظر آتی ہے، وہ ہے بچپن سے پیرانہ سالی تک کا سفر جو پُرآشوب رہا ہے، جو اپنی فیملی کے ذریعہ مسلسل تشدد کا شکار ہوتا رہا ہو، اس کی ذہنی کیفیت مایوسی کے دلدل میں ڈوب سکتی ہے۔ اس کے باوجود نہ ان پر پاگل پن کا دورہ پڑا اور نہ ہی بظاہر مایوسی کے شکار ہوئے۔ ایسا لگتا ہے کہ اللہ رب العزت کی طرف سے ان کو مضبوط قویٰ ملا تھا۔ بچپن اور جوانی کی خرمستیوں سے شاید ہی کوئی محفوظ رہا ہو۔ محمد حسن کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تمام 'رنگین وسنگین' باتوں کی بھنک بھی کسی کو لگنے نہیں دی۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ عمر کے آخری حصے میں غالباً اپنے انتقال سے دس سال قبل وہ شدید جذباتی بحران میں مبتلا ہو گئے۔ ان کو اسی وقت آسودگی ہوسکتی تھی جب تک اخراج واظہار نہ ہوجائے۔ مثال کے طور پر بھوک سے زیادہ کھانے والے کو متلی محسوس ہونے لگے تو جب تک وہ اُگل نہ دے اس کا اضطراب بڑھتا ہی رہے گا۔ نفسیات کی اصطلاح میں اسے کتھارسس (Catharsis) کہتے ہیں دبے ہوئے جذباتی ہیجان کو اس کے سبب کے ساتھ تلازمہ پیدا کر کے اخراج واظہار کا موقع دینا۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک معتبر ومحترم ادیب ومحقق نے اپنے اندر کے بدبودار فاسد مواد کو اُگل دیا ہو۔ لیکن خوف بھی دامن گیر رہا اس لیے اس کی اشاعت کے لیے انتقال سے دس سال کے بعد کی تاکید کی گئی۔

آپ نے بعض ذہنی مریض کو دیکھا ہوگا کہ وہ ہر وقت خاموش رہتا ہے۔ پھر وہ کسی وقت کچھ بُد بُدانے لگتا ہے، اسی کیفیت میں اس کے زبان سے اول فول اور گندی گالیاں بھی نکلنے لگتی ہیں۔ یہ ذہنی مریض انتہائی اعلیٰ اور مہذب خاندان کا بھی ہوگا تب بھی وہ اپنی زبان کو فحش گوئی سے نہیں روک سکتا۔ عمر کے آخری پڑاؤ میں پروفیسر محمد حسن کی شاید یہی نفسیاتی کیفیت ہوگئی تھی۔ اس 'آپ بیتی' سے قبل ان کی کسی تحریر میں 'فحش نگاری' شاید ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔ بہتر ہوتا کہ اس آپ بیتی سے کم سے کم اس کے آخری باب کو نکال دیا جاتا۔ حیرت ہے کہ محمد حسن کی بیٹی ڈاکٹر ثمینہ نے اس کی اشاعت کی اجازت کیونکر دی۔ کچھ بھی ہو اور آج کا مہذب سماج جتنا بھی بگڑ جائے، کم سے کم اردو ادب میں اس طرح کی فحش نگاری انتہائی معیوب ہے اور خود ڈاکٹر محمد حسن جیسے اسکالر کے شایانِ شان نہیں۔

اس آپ بیتی میں بعض مقامات پر غالباً پروف ریڈنگ کے دوران سہواً چند اغلاط در آئی ہیں۔ مثلاً کئی جگہوں پر 'کے ایما' کی جگہ 'کی ایما' ہے۔ اسی طرح واقعاتی غلطیاں بھی راہ پا گئی ہیں۔ سید مودودی کا انتقال کراچی میں نہیں امریکہ کے ایک ہسپتال میں ہوا تھا اور تدفین لاہور میں ہوئی تھی (صفحہ 143)۔ اسی طرح اسرائیلی ریاست کا قیام 1949 میں نہیں بلکہ 1948 میں ہوا تھا (صفحہ 309)۔

□□□

لسانیات کے موضوع پر

صباح الدین احمد کی تین اہم کتابیں

اردو حرف وصوت

صفحات: 106 قیمت:-/150 (مجلد)

املانامہ: تخریب وردّ تخریب

صفحات: 132 قیمت:-/150 (مجلد)

اردو حروف تہجی: تشکیل وردّ تشکیل

صفحات: 128 قیمت:-/150 (مجلد)

-/400 روپے ارسال کر کے تینوں کتابیں رجسٹرڈ ڈاک سے حاصل کریں۔

رابطہ: اردو بک ریویو، نئی دہلی-110002

Tel. 011-44753890 / 9953630788

اردو کے ممتاز صحافی اور محقق محمد طارق غازی کے قلم سے

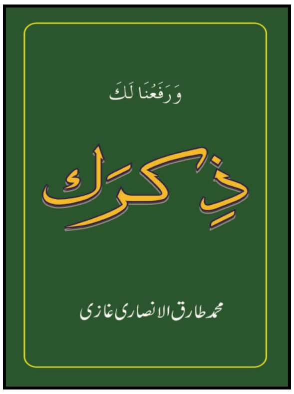

Pages: 744 - Price: Rs. 500/-

سیرت کی کتب میں عموماً واقعات ملتے ہیں لیکن تاریخی تناظر میں ان واقعات کا عمرانی اور سیاسی تجزیہ نہیں ملتا جن کے اثرات مکہ اور مدینہ کی سیاست اور اقتصادیات پر نظر آئے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب نہ صرف منفرد ہے بلکہ پہلی بار سیرت کے عمرانی، سیاسی اور اقتصادی اقدامات کا تاریخی تجزیہ کیا گیا ہے۔

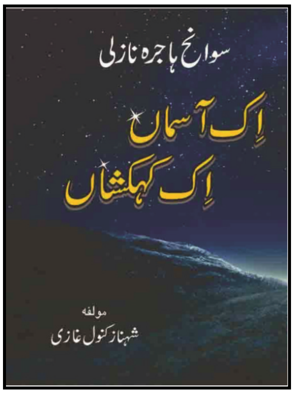

Pages: 348
Price: Rs. 300/-

سوانح ہاجرہ نازلی

یہ سوانحی واقعات مشہور ادیبہ ہاجرہ نازلی کے ہیں۔ ان کے اٹھارہ ناول اور ستّر اسّی کے قریب افسانے اور کہانیاں نیز مختلف موضوعات پر مضامین و مکالمے ماہنامہ بانو دہلی، حریم لکھنؤ اور مختلف ڈائجسٹوں میں شائع ہوتے رہے۔ ان سوانحی واقعات کو ان کی بیٹی شہناز کنول غازی (علی گڑھ) نے مرتب کیا ہے۔

رابطہ

IQRA EDUCATION FOUNDATION
A-2 Firdaus, 24 S.V. Savarkar Road, Mahim West
Mumbai - 400016 **Cell: 9359210010**

URDU BOOK REVIEW
1739/104, First Floor, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj,
New Delhi - 110002 **Tel.: 011 - 44753890 / 9953630788**

Advtt. 02/2025

کیا ہم زندہ ہیں
(Self Awareness)

مصنفہ: علیزے نجف

تبصرہ: محمد عارف اقبال

نفسیات ایک ایسا پیچیدہ عنوان ہے جس کی گہرائی میں اترتے ہی چودہ طبق روشن ہوجاتے ہیں۔ جدید ماہر نفسیات نے نفسیات کی شاخوں (branches) میں انسانی نشوونما کی نفسیات، تعلیمی نفسیات، صنعتی نفسیات، معاشرتی نفسیات، کلینکی نفسیات، نفسیاتی جانچ، جرائم کی نفسیات، عضویاتی نفسیات، تقابلی نفسیات، طبی نفسیات، صارفوں کی نفسیات، ماحولیاتی نفسیات، تنظیمی نفسیات وغیرہ کو شمار کیا ہے۔ گویا نفسیات کے اتنے شعبے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ دنیا کی آبادی کا صرف دو فیصد نکال دیں تو 98 فیصد انسان کسی نہ کسی نفسیاتی مرض میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ماہرین نفسیات نے ابھی تک حکمرانی اور جنگوں کی نفسیات کا جائزہ نہیں لیا ہے۔

جاسوسی ادب کے معمار ابن صفی نے انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کے ایک ناول (فریدی حمید سیریز) 'خونی ریشے' (ستمبر 1969) کا ایک دلچسپ مکالمہ ملاحظہ کیجیے:

''صبح ناشتے میں نفسیات، دوپہر کے کھانے میں نفسیات، رات کے کھانے میں نفسیات، اونگھنے میں نفسیات، چھینکنے میں نفسیات!''

''اوہ تو کیا تمہارے ملک میں اس مضمون سے بہت زیادہ دلچسپی لی جا رہی ہے؟''

صفحات: 240 قیمت:-/399 اشاعت: جنوری 2025
ISBN 978-93-94081-65-9
ناشر: علیزے نجف، موبائل نمبر: 9648972516
Email: alizey.najaf@gmail.com
زیر اہتمام: ورلڈ اردو پبلی کیشن اینڈ ریسرچ سنٹر، نئی دہلی۔

''افسانوں سے لے کر گورکنی کے پیشے تک میں گھسی ہوئی ہے۔ گورکن قبر کھودتے کھودتے سوچ میں گم ہوجاتا ہے کہ آخر عورتوں نے اس پیشے کو کیوں نہیں اپنایا... سمجھ میں نہیں آتا تو قبر ادھوری چھوڑ کر یونیورسٹی کی راہ لیتا ہے!''

''یونیورسٹی...؟''

''ہاں یونیورسٹی... اور وہاں سے فرائڈ فرائڈ کا نعرہ لگاتا ہوا واپس آتا ہے اور پہلے سے بھی زیادہ تندہی سے گورکنی میں مصروف ہوجاتا ہے۔''

اس مکالمہ کو پڑھنے کے بعد بے ساختہ معروف افسانہ نگار ڈاکٹر محمد محسن کی یاد آتی ہے جن کا افسانہ 'انوکھی مسکراہٹ' ایک عرصہ تک اردو فکشن میں بحث کا موضوع رہا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی خیال بھی 'گورکنی' ہے۔

اپلائڈ سائیکیالوجی (اطلاقی نفسیات) کے استاذ رفیق جعفر اپنی کتاب 'نفسیات' میں لکھتے ہیں کہ:

''مشہور مسلمان فلسفی اور ماہر طب ابن سینا نے اپنے طبّی تجربے کی بنیاد پر یہ نظریہ پیش کیا کہ صحت مند افراد وہم سے بیمار ہوجاتے ہیں اور بیمار افراد قوت ارادی سے صحت مند ہوجاتے ہیں۔ ایما (Suggestion) اور نومیت (Hypnotism) کے ذریعے دوسروں میں بیماری پیدا کی جاسکتی ہے یا ان کا علاج کیا جاسکتا ہے۔''

'کیا ہم زندہ ہیں؟' کی مصنفہ علیزے نجف صحافی اور شاعرہ ہیں۔ کتاب کا آغاز مصنفہ نے بنجامن فرینکلن (1706-1790) کے ایک قول سے کیا ہے:

''کچھ لوگ پچیس سال کی عمر میں مرجاتے ہیں؛ لیکن پچھتّر سال کی عمر میں انہیں دفن کیا جاتا ہے۔''

بنجامن فرینکلن (Benjamin Franklin) نے یہ بھی کہا تھا:

"He that lives upon hopes will die fasting."

عہد حاضر میں پوری انسانی برادری جس نفسا نفسی کا شکار ہے، اور بالخصوص نوجوانوں میں مایوسی کی لہر پیدا ہوتی جا رہی

ہے، اس کی وجہ سے سوشل میڈیا پر Motivational Lectures کی وبا عام ہوگئی ہے۔ اس کے باوجود نفسیاتی امراض میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ کسی بھی انسان کے نفسیاتی مرض کی کیفیت کو محسوس کرنا اور جاننا انتہائی مشکل امر ہے۔ کیونکہ نفسیاتی مرض دکھائی نہیں دیتا۔ یہ ایسا خاموش مرض ہے کہ بعض اوقات برسوں اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ یہ مریض افراد خاندان اور اپنے دوستوں میں گھل مل کر رہتا ہے۔

'کیا ہم زندہ ہیں' لکھنے کی بنیادی وجہ شاید یہی ہے کہ نفسیاتی طور پر ہم عہد شباب میں ہی اپنے اندرون کو مرنے سے بچا سکیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کر سکے تو بظاہر ہمارا جسم زندہ رہتا ہے لیکن ذہنی طور پر ہمارے زندگی کی رمق آہستہ آہستہ مفقود ہوتی جاتی ہے۔ سادہ الفاظ میں علیزے نجف نے بتایا ہے:

''میری یہ کتاب نفسیاتی بیماریوں کا احاطہ کرنے کی غرض سے نہیں لکھی گئی ہے؛ جبکہ یہ درحقیقت ان بنیادی اصولوں کی بات کرتی ہے جس کے ذریعے ہم عام اور روزمرہ زندگی کو تھوڑا بہتر بنا سکتے ہیں اور اپنے جذبات کو بیمار ہونے سے بچا سکتے ہیں۔'' (صفحہ:14)

اس کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز (مدیر ماہنامہ سائنس) کے قلم سے ہے۔ کینیڈا کے ماہر نفسیات ڈاکٹر خالد سہیل نے بھی اس کتاب کا جائزہ اپنے مختصر مضمون میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر خالد سہیل لکھتے ہیں:

''ذہنی امراض اور نفسیاتی مسائل پر بات کرنا اور اس سے متعلقہ ماہرین کے پاس جانا ہمارے معاشرے میں آج بھی شجر ممنوعہ کی طرح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ آج بھی ماہرین نفسیات سے رجوع کرنے کے بجائے پیروں، فقیروں کے پاس جا کر گنڈا، تعویذ سے علاج کرواتے ہیں اور پھر شکایت کرتے ہیں کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔''

علیزے نجف کی کتاب کے مشمولات 22 مضامین پر مشتمل ہیں۔ ہر موضوع غور و فکر کے نئے در وا کرتا ہے۔ ان موضوعات میں Comfort Zone, Toxic Positivity, Over Thinking کے مضر اثرات، Motivation with Discipline اور 'مقصد زندگی کا تعین' خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ کتاب مذہبی نکتہ نظر سے نہیں لکھی گئی ہے بلکہ اس میں عام انسانوں کے سامنے نفسیاتی فلسفہ کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر خالد سہیل نے درست لکھا ہے کہ:

''علیزے نجف ایسی علم دوست لکھاریوں میں سے ایک ہیں جو اپنے خیالات، نظریات اور تصنیفات سے انسانی ارتقا کے سفر میں مثبت کردار ادا کرتے ہیں۔ علیزے نجف ان دانشوروں میں سے ایک ہیں جو سقراط کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ سقراط نے کہا تھا کہ 'وہ زندگی ہی کیا جس میں خود آگہی نہ ہو'۔

"Unexamined Life is not worth Living"

مصنفہ لکھتی ہیں:

''معتدل مثبت سوچ رکھنے والے لوگ حالات اور مسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے نظریات میں تبدیلی لانے کو تیار ہوجاتے ہیں۔ اس کے برعکس ٹاکسک پازیٹیویٹی والے لوگ مشکلات اور چیلنجز کو ماننے سے سرے سے ہی انکار کر دیتے ہیں۔'' (صفحہ:54)

واضح ہو کہ نفسیاتی الجھنوں کے بارے میں قرآن مجید سے بہتر رہنمائی کہیں نہیں مل سکتی۔ یہ کتاب ہدایت ہے جس کا مرکزی موضوع انسان ہے۔ دنیا سے محبت، لالچ، مفاد پرستی، بےراہ روی، نفسانی خواہشات کی غلامی، ہزاروں انسانی مسائل ہیں جن کے متعلق قرآن رہنمائی کرتا ہے۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ دنیا انسان کے لیے عارضی قیام گاہ ہے۔ اصل ابدی گھر تو جسمانی موت کے بعد ہی ممکن ہے۔ اگر علیزے نجف اس حوالے سے بھی اپنے قارئین کی رہنمائی کرتیں تو نفسیاتی الجھنوں کے حل میں زیادہ کارآمد ہوسکتی تھیں۔ سورۃ الحدید آیات 19 تا 21 دیکھیے۔ ان آیات میں بچپن سے بڑھاپے تک کے انسانی نفسیات پر بلیغ رہنمائی ملتی ہے۔ شاید کم ہی لوگوں کو اس بات کا ادراک ہے کہ تمام نفسیاتی امراض کی جڑیں دنیا کی محبت اور آخرت کی ابدی زندگی کا انکار ہے (خواہ قولی ہو یا عملی)۔

انسان کی صلاحیتیں کیوں زنگ آلودہ ہوجاتی ہیں؟ Comfort Zone کے حوالے سے علیزے نجف لکھتی ہیں:

''کمفرٹ زون یعنی خطۂ آرام ایک نشہ کی طرح ہے جو انسان کو اندر سے مزید حصول کے لیے جوش و جذبے سے عاری

کردیتا ہے۔اس کی صلاحیتیں زنگ آلود ہو کے اپنی پہچان کھو دیتی ہیں۔وہ کنویں کی مینڈک کی طرح اپنے محدود خطے کو پوری کائنات سمجھ بیٹھتا ہے۔'' (صفحہ:87)

حد سے زیادہ سوچنا یعنی Over Thinking کے مضر اثرات پرعلیز ے نجف لکھتی ہیں:

''تحقیق سے اوورتھنکنگ کے کئی سارے نقصانات سامنے آچکے ہیں۔ماہرین کہتے ہیں کہ بہت زیادہ سوچنے سے ڈپریشن کا خدشہ کئی گناہ بڑھ جاتا ہے اوراس کی وجہ سے ہماری نیند بھی متاثر ہوتی ہے۔بعض اوقات سونے کے لیے مسکن ادویات بھی لینی پڑتی ہے۔'' (صفحہ:117)

مقصد زندگی ہی سے منزل کی واضح نشاندہی ہوتی ہے جس سے انسان نفسیاتی الجھنوں (Complexes) سے محفوظ رہ سکتا ہے۔علیز ے نجف لکھتی ہیں:

''مقصد، انسانی زندگی کا ایک اہم ستون ہے،جس پر اس کی شخصیت کی معنویت کا انحصار ہوتا ہے؛ لیکن جب ہم بےمقصد بس یوں ہی وقتی خواہشات کے تحت زندگی گزارر ہے ہوتے ہیں تو ہم اپنی کوششوں کو حکمت عملی کے ساتھ انجام دینے کے بجائے بس یوں ہی گزرجاتے ہیں اور ناکام ہونے کی صورت میں مایوس ہوکر کوشش کرنا ہی ترک کردیتے ہیں۔'' (صفحہ:159)

آج کے معاشرے میں اس قدر ذہنی الجھنیں (Complexes) پائی جاتی ہیں کہ تشخیص کرنا ناممکنات میں سے نظر آتا ہے۔ Human Behaviour کے کسی بھی تحقیقی ادارے میں چلے جائیے تعلیم یافتہ گھرانے کی بچیاں اور بچے عجیب وغریب حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ایسی صورت میں تعلیم یافتہ افراد کے لیے 'خوداحتسابی' زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔اس کے لیے علیز ے نجف کی یہ کتاب 'کیا ہم زندہ ہیں' دلچسپ ہی نہیں بلکہ زندگی کی کئی قیمتی گتھیوں کو سلجھاتی ہے اور انسانی زندگی میں بہتر مثبت اثرات مرتب کرسکتی ہے۔طلبا، طالبات، اساتذہ کے ساتھ ہر نوجوان کے لیے یہ کتاب خاموش مددگار اور Self Awareness میں مفید تر ہے۔ضرور مطالعہ کیجیے اور فائدہ اٹھائیے۔کیونکہ ڈاکٹر جویریہ سعدیہ (آسٹریلیا) کے بقول ''ان کی تحریروں سے خوداحتسابی ہی نہیں بلکہ بلند ہمتی اور زندگی کے تئیں مثبت رویہ رکھنے کی بھی ترغیب ملتی ہے۔''

□□□

نشریاتِ سرور

(آل احمد سرور کی ریڈیائی تحریر)

ترتیب وتحشیہ: ڈاکٹر محمد شکیل اختر

تبصرہ: ڈاکٹر سیّد تنویر حسین☆

ڈاکٹر محمد شکیل اختر کا تعلق جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے انور جمال قدوائی ماس کمیونی کیشن ریسرچ سنٹر سے ہے، وہاں وہ پروڈیوسر ریڈیو ہیں۔انہوں نے 2004 میں 'اردو میں نشریاتی ادب' موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر کلکتہ یونیورسٹی، کولکاتہ سے پی ایچ. ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ان کے نگراں پروفیسر مظفر حنفی تھے۔ 2007 میں گروجمبھیشور یونیورسٹی، حصار (ہریانہ) سے ماس کمیونی کیشن میں بھی ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔جامعہ ملیہ اسلامیہ میں 2007 سے اس عہدہ پر فائز ہیں۔اس سے قبل آکاش وانی کی سروس میں تھے، جہاں وہ 1992 سے 2007 تک رہے۔زیرنظر کتاب کے علاوہ ان کی دیگر مطبوعات حسب ذیل ہیں:

(۱) اردو میں نشریاتی ادب، (۲) یہ خلد بریں ارمانوں کی، (۳) روبرو [ریڈیو انٹرویوز کا مجموعہ]، (۴) بھلائے نہ بنے، (۵) ریڈیو ڈراما: تاریخ وتکنیک، (۶) ریڈیائی تحریروں میں فکر اقبال کی عکاسی، (۷) غالب بصد انداز [غالب پر ریڈیائی تحریریں]، (۸) اردو نشریات: مسائل اور امکانات، (۹) بنگال میں اردو صحافت [1947 تا 2020]۔مطبوعات کی فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نشریاتی ادب میں خدمات وقیع ہیں۔

آل احمد سرور کا نام اردو دنیا میں بہت اہم ہے، وہ نقاد اور

صفحات: 376 قیمت:-/580 اشاعت:2023
ISBN 978-93-6062-941-0
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، D1/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی-110002
مصنف سے رابطہ:9821170438

شاعر تھے۔ ان کی پیدائش بدایوں میں 9 ستمبر 1911 کو اور وفات 9 فروری 2002 کو ہوئی۔ ان کی شعروادب سے دلچسپی کم عمری سے ہی تھی مگر وہ گریجویشن تک سائنس کے طالب علم رہے۔ بی ایس سی کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انہوں نے ڈبل ایم اے انگریزی اور اردو میں کیا۔ اس طرح وہ باضابطہ طور پر ادب کی دنیا میں داخل ہوگئے۔ بقول ڈاکٹر شکیل اختر: ''وہ بنیادی طور پر انگریزی زبان وادب کے شناور تھے مگر وہ نازنینانِ حرم میں اردو کے اسیر تھے۔'' (مقدمہ صفحہ 10) ان کی تقریباً بیس کتابیں منظر عام پر آئیں۔ بحیثیت نقاد انہوں نے ایک عہد کو متاثر کیا۔ ان کی تحریریں آج بھی بڑے ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

زیر نظر کتاب میں ڈاکٹر محمد شکیل اختر نے تلاشِ بسیار کے بعد آل احمد سرور کی 38 ٹاکس، 3 فیچر، 3 انٹرویوز اور 3 مباحثوں کو مدون کیا اور 26 صفحات پر مشتمل ایک تفصیلی مقدمہ بھی لکھا۔ کتاب کے آخر میں آل احمد سرور کی ان 12 ریڈیائی تحریروں کی ایک فہرست بھی دے دی گئی ہے جن تک مرتب کی رسائی نہیں ہوسکی۔ تحقیق کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ مستقبل کے محقق کی رہنمائی کی جائے۔ یہ کام بھی مرتب نے بخوبی کیا ہے۔ مرتب نے مقدمہ میں بہت سارے نکات پر روشنی ڈالی ہے، اس طرح مقدمہ کو جامع اور مانع بنانے کی کوشش کی۔ صرف ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے، اسی سے مقدمہ کی خوبی اور کتاب کی افادیت اجاگر ہوجائے گی۔ وہ لکھتے ہیں:

''آلِ احمد سرور نے جب ریڈیو کے لیے لکھنا شروع کیا، وہ ریڈیو کا ابتدائی زمانہ تھا اور لکھنے والوں کے سامنے اس کی کوئی نظیر نہیں تھی اور ٹاکرس نے اپنی استعداد کی بنیاد پر اسپوکن ورڈ (Spoken Word) کا استعمال کیا اور روانی میں لکھتے ہوئے کبھی کسی شاعر یا ادیب کا پورا نام نہیں لکھا۔ ایک ہی نام کے کئی ادیب ہوسکتے ہیں تو سننے والوں کے لیے یہ طے کرنا فوراً دشوار ہوتا ہے کہ ٹاکرس کس ادیب اور شاعر کی بات کر رہا ہے... اس کی مثالیں بھی آل احمد سرور کی ریڈیائی تحریروں میں جا بجا ملتی ہیں اور وہ روانی میں لکھتے ہوئے غیر دانستہ طور پر اس کا التزام نہیں کرتے جیسے آزاد، سکسینہ، علوی وغیرہ۔ لہٰذا اس کی وضاحت حاشیے میں یا نام کے ساتھ ہی قوسین میں کردی گئی ہے تاکہ آل احمد سرور کی ریڈیائی تحریروں کی معنویت اور زیادہ بڑھ سکے۔'' (صفحہ:33)

بیک کور (Back Cover) پر پروفیسر شافع قدوائی نے 'مقدمہ' کے بارے میں بجا طور پر لکھا ہے کہ ''عام روِش کے برخلاف ممدوح کی شان میں قصیدہ گوئی اور اپنی کاوش کی روداد دل پذیر نہیں بیان کی گئی ہے بلکہ تسامحات کی نشاندہی تنقیدی دقت نظری کے ساتھ کی گئی ہے۔ ... شکیل اختر نے تحقیقی تن آسانی اور تنقیدی کساد بازاری کے دور میں اس نوع کی کتاب مرتب کرکے اہم علمی فریضہ انجام دیا، جس کے لیے وہ ہدیۂ تبریک کے مستحق ہیں۔''

پروف کی غلطیوں سے پاک کتاب خوبصورت چھپی ہے۔ سرورق جاذب نظر ہے۔ ہوشربا مہنگائی کے زمانہ میں قیمت مناسب ہی کہی جائے گی۔

☆ مبصر کا پتہ: شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-110025
Mobile: 9868781964

□□□

قرآنی آیات اور مضامین کے حوالے سے
دینی موضوعات پر اہم تالیف
اوراقِ حکمت
مؤلف: ابرار احمد
ISBN 978-93-90579-94-5
اشاعت: مارچ 2025 صفحات: 672 (مجلد)
قیمت: -/800 روپے
ناشر: القاسم پبلی کیشنز، سوائی مادھو پور، راجستھان۔
ملنے کا پتہ: اردو بک ریویو، نئی دہلی۔
Tel. 011-44753890 / 9953630788

اصول تحقیق: جدید ریسرچ کے اصول وضوابط

مصنف: ڈاکٹر ظفرالاسلام خان

مترجمین: پروفیسر فیضان اللہ فاروقی وڈاکٹر عبدالرحمٰن طیب

نظر ثانی: پروفیسر شفیق احمد خان ندوی، ڈاکٹر تابش مہدی

تبصرہ: شفیق الرحمٰن☆

یہ کتاب ڈاکٹر ظفرالاسلام خان صاحب کی عربی تصنیف دلیل الباحث (عمان / بیروت، 1996) کا اردو ترجمہ ہے۔ پہلا اردو ایڈیشن 1998 میں شائع ہوا تھا، دوسرا 2007 میں اور تیسرا نظر ثانی واضافہ شدہ ایڈیشن 2024 میں چھپا ہے۔ انتساب والد محترم (مولانا وحیدالدین خاں مرحوم) کے نام ہے۔ اس تیسرے ایڈیشن کا دیباچہ ڈاکٹر ظفرالاسلام خان صاحب نے خود لکھا ہے جبکہ پیش لفظ پروفیسر شفیق احمد خان ندوی کا لکھا ہوا ہے۔ تمہید بھی ڈاکٹر صاحب موصوف (مصنف کتاب ہذا) نے باندھی ہے۔ کتاب من جملہ چھ ابواب پر مشتمل ہے جو درج ذیل ہیں:

۱۔ علمی تحقیق کی غرض غایت اور اس کے مبادی

۲۔ بنیادی اور ثانوی مآخذ

۳۔ کچھ بنیادی مآخذ

۴۔ انٹرنیٹ پر عربی اور اسلامی مآخذ

۵۔ سماجی موضوعات پر تحقیق

۶۔ علمی تحقیق کے فنی پہلو

تین ضمیمہ جات بھی ہیں:

۱۔ علمی مجلات کے لیے مقالات کیسے لکھیں؟

صفحات: 186 قیمت:-/270 تیسرا ایڈیشن:2024

ISBN 978-81-7221-139-4

ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اینڈ عربک اسٹڈیز، نئی دہلی۔

ملنے کا پتہ: فاروس میڈیا اینڈ پبلشنگ پرائیویٹ لمیٹڈ

D-84، ابوالفضل انکلیو ا، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025

Tel. 011-26947483-26952825 / 9818120699

Email: books@pharosmedia.com

۲۔ مغربی تصنیفات میں بالعموم استعمال ہونے والے رموز و اختصارات

۳۔ عربی، فارسی اور اردو حروف کو لاطینی رسم الخط میں لکھنے کی اسکیم

تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ (root word) ح ق ق ہے۔ یہ ایک نہایت اہم اور بنیادی قرآنی اصطلاح ہے اور ایک تصور (concept) ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں اس کا مفصل بیان آیا ہے:

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ○ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ○ (الانفال:۷۔۸)

وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ○ (یونس:۸۲)

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۚ فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ ۗ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ۗ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ○ (الشوریٰ:۲۴)

ان کے علاوہ بھی بے شمار مقامات پر اس کا ذکر آیا ہے۔ دو درجن سے زائد مقامات پر تو لفظ حق کے ساتھ اور اس سے کہیں زیادہ اس کے مشتقات کے حوالے سے۔ اس سے اس کی معنویت، حقیقت، نوعیت، حیثیت، حکمت، غرض و غایت اور اس کے مالہ و ما علیہ کا علم وادراک ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس کتاب کے علمی پہلو کو بہت خوبی اور نہایت شرح و بسط کے ساتھ مثالیں دے دے کر اجاگر کیا ہے۔ بلاشبہ یہ علمی و تحقیقی کام کرنے والو کے ایک رہنما کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے ریسرچ اسکالروں کو بے شک بہت فائدہ پہنچے گا۔

تحقیق وہ عمل ہے جو ایک طرف حق کے حق ہونے کو ظاہر کرتا ہے وہیں باطل (غیر حق) کے فسوں کا پردہ چاک کرتا ہے اور یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ لہٰذا اس راہ کا انتخاب کرنے والوں کو اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ یہ دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے Do's and Don'ts کی اس طرح صراحت کردی ہے کہ احتمال کی کوئی گنجائش نہیں رہنی چاہیے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اس راہ کو آسان تر بنانے کی ہر

ممکن کوشش کی ہے اور ضروری، مفید، کارآمد اور رہنما مواد کو بھی یہاں جمع کر دیا ہے۔ انہوں نے ایک سنجیدہ اور واقعی ریسرچ اسکالر کو غنی کر دینے کے تمام ضروری سامان بہم پہنچانے کا اپنے تئیں پورا پورا اہتمام کیا ہے۔

☆ مبصر کا پتہ: سابق ایڈیٹر، دعوت سہ روزہ، نئی دہلی۔
Mobile: 7011787599

□□□

پٹنہ یونیورسٹی میں فارسی تحقیق
تعارف وتجزیہ

مصنف: رضوان اللہ آروی
(Mobile: 9472400698)

تبصرہ: ڈاکٹر زہرہ خاتون☆

علم و ادب کی دنیا میں چند ایسی نابغۂ روزگار شخصیات ہوتی ہیں جو اپنے تخلیقی فکر وفن کے چراغ سے نہ صرف اپنے عہد کو منور کرتی ہیں بلکہ آئندہ نسلوں کے لیے بھی رہنمائی کے کئی چراغ روشن کر جاتی ہیں۔ انہی میں سے ایک رضوان اللہ آروی صاحب ہیں جن کا نام محمد رضوان اللہ اور آرہ (بہار) کا ہونے کی نسبت سے قلمی نام میں آروی کا اضافہ کیا۔ ایک استاد ہونے کے ساتھ ہی ساتھ وہ مصنف، مترجم، محقق، نقاد، شاعر نیز رپورٹر جیسی بے شمار صفات کے حامل ہیں۔ یہ میں نہیں کہہ رہی ہوں بلکہ ان کی وہ متعدد تصنیفات ہیں جو قبول عام حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی پیدائش 12 مئی 1959 کو آرہ کے ایک علمی خانوادہ میں ہوئی۔ تعلیم و تربیت کے معاملے میں انہوں نے اپنے وطن کو ترجیح دی اور ابتدائی تعلیم کے بعد ثانوی تعلیم کے لیے فارسی مضمون کا انتخاب کیا، چنانچہ اردو و فارسی میں ایم اے کرنے کے بعد پٹنہ

صفحات: 368 قیمت:-/400 اشاعت:2025
ISBN 978-93-6062-349-4
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، D1/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی-110002، فون:011-41418204

یونیورسٹی سے پی ایچ – ڈی کی سند حاصل کی۔ پھر ایچ ڈی جین کالج کے شعبۂ فارسی و اردو سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس تدریسی سفر کا اختتام گزشتہ سال 31 مئی 2024 کو بصورت سبکدوشی اپنی منزل مقصود کو پہنچا۔ اس دوران ادبی تخلیقات کا سلسلہ بھی جاری رہا اور کئی اہم موضوعات پر ان کی کتابیں منظر عام پر آئیں، جن میں عظیم آباد کے فارسی اساتذہ، بہار کی فارسی شاعری کے فروغ میں شعرائے پھلواری کا حصہ، 'لفظ ومعنی' و چراغوں کا دھواں (رپورتاژ) وغیرہ قابل ذکر ہیں اور ریختہ پر بہ آسانی دستیاب ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'پٹنہ یونیورسٹی میں فارسی تحقیق: تعارف و تجزیہ' ایک اہم تصنیف اور قابلِ ستائش تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس سے پہلے اگرچہ چند یونیورسٹیوں کے تحقیقی مقالوں کی فہرست کو شائع کرنے کی شروعات مجلّہ دبیر (کاکوری) سے ہوئی تھی جس میں علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور پٹنہ یونیورسٹی کے فارسی کے تحقیقی مقالوں نیز ان کے نگراں و سنہ کتابت کی فہرست شائع ہوئی تھی۔ اس سے مقالات کے عناوین سے تو شناسائی ہوئی اور آئندہ تحقیق کاروں کو رہنمائی بھی مگر کہیں نہ کہیں تشنگی کا احساس باقی رہا۔ رضوان اللہ صاحب کی اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں 1935 سے یونیورسٹی کے تحقیقی مقالات کا تجزیاتی مطالعہ مع تعارف اور دیگر تفصیلات نہایت ہی سادہ و سلیس زبان میں پیش کی گئی ہیں۔ خود مصنف کے الفاظ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا تحقیقی کام ہے جو دوسرے محققین کے لیے ایک عمدہ مشعل راہ ثابت ہوگا۔

رضوان صاحب کے مطابق اس سے پہلے اگرچہ بہار کے معروف افسانہ نگار احمد یوسف نے بطور پروجیکٹ خدا بخش فیلوشپ کے تحت اسی طرح کے ایک موضوع پر کام کیا تھا جس کا موضوع تھا: ''پٹنہ یونیورسٹی کے اردو تھیسس کا جائزہ''۔ اس میں انہوں نے پٹنہ یونیورسٹی کے تقریباً پچاس سے زائد تھیسس کا تنقیدی جائزہ پیش کیا تھا۔ اس زمانے کے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار (مرحوم) کی پیشکش پر یہ کام کیا گیا اور ان کا منصوبہ اردو تھیسس کے ساتھ عربی و فارسی کی تھیسس کا جائزہ بھی شامل تھا لیکن افسوس کہ ان کی

اس فکر کو عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکا۔ مزید افسوس یہ کہ احمد یوسف صاحب کی تیار کردہ فہرست بھی برسوں گزر جانے کے بعد شائع نہ ہوسکی یہاں تک کہ موصوف کا انتقال ہوگیا۔ 1995 میں صرف سات صفحات پر مشتمل ایک اشاریہ کی شکل میں خدابخش لائبریری نے اسے شائع کیا جس میں عابد رضا بیدار صاحب کا چند سطروں میں ایک مختصر تعارف بھی شامل تھا، جو کچھ اس طرح تھا:

''خدابخش لائبریری کے منصوبوں میں ایک یہ بھی رہا کہ تمام جامعات نہ سہی، بہار کی جامعات کے اردو، فارسی، عربی تھیسسوں کے سلسلے میں مختصر تعارف وتبصرہ تیار کیا جائے۔ جناب احمد یوسف صاحب نے پٹنہ یونیورسٹی کے تمام اردو تھیسسوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ان کا یہ قیمتی مسودہ خدابخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ جائزہ کی موضوع وار، مصنف وار اور عنوان وار فہرستیں یہاں حوالے کے لیے پیش کی جارہی ہیں۔ امید ہے اس سے اردو میں تحقیقی کام کرنے والوں کو مدد ملے گی۔'' (صفحہ 12)

اس تحقیقی کام کے تئیں جب رضوان صاحب نے قلم اٹھایا تو یہ فہرست خاصی طویل نظر آئی جس کا سلسلہ 1935 سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ تحقیق تقریباً 90 سال کی تمام فارسی تحقیقی کارگزاریوں کا احاطہ کرتی ہے۔ رضوان اللہ صاحب نے اس کام کی شروعات کئی دہائیوں پہلے ہی کردی تھی، لیکن ملازمت کے سلسلے میں انہیں کئی برسوں تک اپنے وطن عزیز سے دور رہنا پڑا اور اس طرح یہ تحقیقی کام معرضِ التوا میں پڑتا گیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جب پٹنہ واپس آئے تو ازسرنو اس کام کا آغاز کیا اور یہ امران کے لیے باعث مسرت رہا کہ اس طویل عرصے میں پی ایچ-ڈی اسکالروں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوچکا تھا۔ مزید یہ کہ جو تلامذہ تھے اُن میں سے بیشتر، اساتذہ کے منصب پر فائز ہوچکے تھے۔ نیز نئے پرانے تحقیقی مقالات کے تجزیاتی مطالعہ نے یہ احساس بھی دلایا کہ موضوعات کی سطح پر تنوع اور وسعتِ دائرہ کار میں بھی خاطرخواہ اضافہ ہوا یعنی جہاں پہلے صرف شخصیت اور کارناموں یا تدوین متن یا دیوان پر کام ہوا کرتے تھے اب وہاں تاریخ، تذکرہ، تصوف، ادب اطفال یا تخلیقات خواتین کے عنوانات بھی تحقیقی مقالوں کے موضوعات میں شامل ہوئے۔ بہرکیف اس مختصر تمہید کے بعد آئیے اب اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

زیرتبصرہ کتاب میں رضوان صاحب نے کل 83 مقالات کا احاطہ کیا ہے جو پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی سے متعلق ہیں۔ مقالات کے متنوع موضوعات کے تحت انہوں نے اس فہرست کو تین زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا ایران کا فارسی ادب، دوسرا ہندوستان کا فارسی ادب اور تیسرا حصہ بہار کے فارسی ادب سے تعلق رکھتا ہے۔ ان میں زبان کی کوئی قید نہیں رکھی گئی ہے کیونکہ بیشتر مقالات اردو یا فارسی زبان میں ہی لکھے گئے ہیں۔ البتہ چند مقالات انگریزی میں بھی لکھے گئے ہیں لیکن یکسانیت کا خیال رکھتے ہوئے تمام مقالات کے عنوانات اردو میں ہی درج کیے گئے ہیں۔ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مقالات کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی ہے البتہ تعارف میں ان کی صراحت ضرور موجود ہے۔ بعض مقالات کے موضوعات ہند وایران دونوں ممالک کے فارسی ادب کا احاطہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسے مقالوں کو ایرانی ادب کے زمرے میں ہی شامل کیا گیا ہے البتہ سند کے سال تفویض میں مقدم ومتاخر کی ترتیب رکھی گئی ہے یعنی تقدم زمانی کے لحاظ سے فہرست مرتب کی گئی ہے۔

پہلا حصہ جو ایران کے فارسی ادب سے متعلق ہے اس میں 25 مقالات ہیں۔ ہر ایک مقالے پر تبصرہ کرنا تو مشکل ہوگا اور اگر یہ کام کیا ہی جائے تو یہ تبصرہ، تبصرہ نہ ہوکر اچھا خاصا طویل مقالہ ہوجائے گا۔ تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے ان کے عناوین کچھ اس ترتیب سے ہیں:

علی قلی سلیم تہرانی: حیات وکارنامے، حکیم رکن الدین مسیح کاشی: حیات وکارنامے، فارسی شاعری میں ہجانویسی، فارسی میں مرثیہ نگاری (عہد قاچار میں)، فارسی میں نعتیہ شاعری (انیسویں صدی عیسوی تک)، مرزا فصیحی ہروی کے حالاتِ زندگی اور ان کے آثار کی تدوین، خواجہ حسین ثنائی مشہدی: حیات اور کارنامہ، فارسی سفرنامے، سبک ہندی در شعر فارسی، حکیم شیخ حسین شہرت شیرازی کے آثار کا تنقیدی مطالعہ، صوفی مازندرانی: احوال و آثار، احوال وآثار میرنجات اصفہانی مع تصحیح تحشیہ دیوان، بہرام سقا: حیات وکارنامے مع تدوین دیوان، عبدالرزاق فیاض:

حیات و کارنامے، طاہر وحید قزوینی: احوال و آثار، دیوان درویش حسین والہ ہروی، تدوین انتقادی ریاض التواریخ از طاہر وحید قزوینی مع احوال وآثار، علی نقی کمرہ، دورصوفیہ کا ایک ممتاز شاعر (مع تدوین وتحشیہ دیوان)، احوال و آثار امامی ہروی (مع ترتیب وتدوین متن دیوان)، فوقی یزدی: حیات و آثار، عہد قاچاریہ میں فارسی شاعری، دیوان مرزا محمد مجذوب تبریزی تدوین تصحیح مع مقدمہ، تصحیح مثنویات طاہر وحید قزوینی مع احوال وآثار، شاپور: احوال آثار اوراس کے دیوان کا مکمل متن، طاہر وحید قزوینی کی غزل گوئی ایک تجزیاتی مطالعہ۔

کتاب کا دوسرا حصہ ہندوستانی فارسی ادب پر محیط ہے۔ اس میں کل 32 مقالات حسب ترتیب ذیل شامل ہیں:

ہندوستان کے قدیم فارسی شعرا، تذکرہ ہمیشہ بہار، تصحیح و تدوین متن، سیر المتاخرین کے مصنف سید غلام حسین خاں کے حیات و کارنامے، گلزار جعفری، مرزا محمد فاخر مکین کے فارسی خطوط، شیخ سعداللّٰہ مسیحا کیرانوی: حیات و کارنامے مع تدوین انتقادی، مثنوی رام وسیتا، درویش حسین والہ ہروی: حیات و کارنامے مع تدوین دیوان، موہن لعل انیس اور اس کا تذکرہ انیس الاحباء، مثنوی نل دمن فیضی: تحقیق وتدوین، احوال آثار ناصر علی سرہندی مع تدوین وتحشیہ مثنویھا ی او، ہندوستان کا فارسی ادب (اورنگزیب کے بعد سے 1857 تک)، مشرف جہاں کی حیات وشاعری اور دیوان کا تنقیدی متن، خلاصۃ الافکار مرزا ابوطالب مع نقد وترتیب خاتمہ، ہندوستان میں فارسی قصہ نویسی، احوال وآثار سید حسین خالص، مرزا غالب کی فارسی شاعری اوران کا فن، مرزا ارادت خاں واضح: حیات وخدمات، نورالعین واقف: حیات وشاعری، کلیات میر یحییٰ کاشی مع احوال زندگانی، ترابی اور تدوین وترتیب دیوان، احوال وآثار ملا طغرا مشہدی، تدوین انتقادی دیوان نسبتی تھانیسری مع احوال وآثار، مرزا محمد حسن قتیل کے ادبی کارناموں کا انتقادی جائزہ، ظہور اللّٰہ خان نوا: حیات وشاعری مع ترتیب وتدوین دیوان، فاخر مکین کے ذو لسانین تلامذہ، امام بخش صہبائی کی ادبی خدمات: ایک تنقیدی جائزہ، احوال و آثار قزلباش خاں امید مع تصحیح وتدوین متن، دیوان امیر خسرو نہایت الکمال کی انتقادی ترتیب وتدوین مع تمہید وحواشی، دیوان تحفۃ الصغر (امیر خسرو) مع تصحیح وتدوین دیوان، فارسی ادب میں مغل خواتین کا حصہ، دیوان راجہ رتن سنگھ زخمی کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ مع تمہید وتبصرہ، مرزا اسداللّٰہ خاں غالب کی فارسی تخلیقات کا ایک تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ، میر قمر الدین منت: حیات اورشاعری۔

کتاب کا تیسرا اورآخری حصہ بہار کا فارسی ادب کے عنوان سے ہے۔ اس میں رضوان صاحب نے کل 26 مقالات کا جائزہ پیش کیا ہے جن کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

چودھویں صدی عیسوی میں صوفیائے بہار کے ملفوظات و مکتوبات فارسی، عبدالحمید پریشان کے حیات و کارنامے مع تدوین دیوان، حضرت احمد لنگر دریا بلخی کی حیات و شاعری اور ملفوظات کا تنقیدی جائزہ، احوال وآثار حضرت حسین نوشہ توحید بلخی، حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کی نثری تخلیقات کا انتقادی ولسانی مطالعہ، مشائخ سخن پرداز بھار، فارسی شاعری میں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کی خدمات، بہار کے اہم فارسی گوصوفی شعرا، احوال وآثار شمس الدین حسین عاجز مع ترتیب و تحشیہ کلیات، دیوان طلعت پھلواروی: ترتیب و تدوین مع حیات وکارنامے، مخدوم شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے صوفیانہ اور مذہبی خیالات کا جائزہ: مکتوبات کے آئینہ میں، دیوانِ فرحت تنقیدی ایڈیشن مع احوال وآثار، مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے غیر مطبوعہ مکاتیب کا تنقیدی ایڈیشن، صوبہ بہار کے دومشہور فارسی شعرا: حضرت فرد اورحضرت نصر، عبرتی کی تصنیف 'ریاض الافکار' کی تدوین مع نقد وتبصرہ، مخدوم شاہ محمد منعم پاکباز: حیات وکارنامے، ادبیات فارسی میں حکیم سیّد محمد شعیب منیر پھلواروی کی خدمات، شاہ نور الحق تپاں: حیات و خدمات، محمد سعید حسرت عظیم آبادی کے شعری آثار کی تنقیدی تدوین مع تعارف وتحشیہ، جناب حضور شاہ امین احمد ثبات: حیات وآثار، بہار میں فارسی ادب (1857 تا 1947) مع خصوصی مطالعہ عظیم آباد، پھلواری شریف اور بہار شریف، احوال وآثار مولانا حفیظ الدین لطیفی، شاہ ظہور الحق عمادی کی تالیف تنویرات: تصحیح وتدوین متن مع حاشیہ، احوال وآثار سید شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، مولانا بشارت کریم: حیات وکارنامے،

احوال وآثار محمد عیسیٰ فرتاب۔

یہ وہ موجودہ فہرست ہے جو اس کتاب میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ بھی رضوان اللہ صاحب کے مطابق کئی اور تھیسس ہوں گی جو انہوں نے تلاش کیں پر بروقت دستیاب نہ ہوسکیں جیسے احوال و آثار ملا سعید اشرف و تصحیح مثنوی ہائے او، تصحیح معراج الخیال وزیر علی عبرتی مع احوال و آثار، مرزا فاخر مکین: ایک جائزہ، انشاء نگاری وشعر گوئی وغیرہ۔ بعض ایسی بھی تھیں جن کے اندراج نامکمل تھے یا صفحات بے ترتیب تھے یا ادارہ کی فہرست سازی میں شمولیت سے رہ گئی تھیں۔ بہرکیف انہوں نے پوری متانت اور سنجیدگی سے تمام عناوین کا اختصار کے ساتھ تعارف اور تجزیہ پیش کیا ہے۔ اندازِ بیان دلچسپ اور تحریر سادہ وسلیس ہے جو قاری کو آخر تک اپنے ساتھ باندھے رکھتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دوسری دانش گاہوں کے شعبۂ جات خواہ اردو کے ہوں، عربی کے ہوں یا فارسی کے، یہ کتاب وہاں کے لیے ایک مشعل راہ ثابت ہوگی۔

☆ مبصر کا پتہ: استاذ شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-25
Mobile: 9810906056

□□□

پروفیسر محسن عثمانی ندوی: شخصیت اور پیغام

مرتب: عبدالرحمٰن پاشا (Mob: 7093067074)

تبصرہ: محمد عارف اقبال

حیدرآباد (دکن) کے جواں سال صحافی عبدالرحمٰن پاشا کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ کسی علمی و ادبی شخصیت کی اصل حیثیت اس کی بنیادی فکر اور نصب العین سے ہے۔ اگر اس شخصیت کی مدح سرائی میں کوئی کتاب مرتب کی جائے تو ایسا ہی ہے جیسے اس کی 'تدفین' کا انتظام کردیا گیا ہے۔ پروفیسر محسن عثمانی ندوی سے حیدرآباد میں عبدالرحمٰن پاشا کا مسلسل رابطہ رہا ہے۔ زیرنظر کتاب کے 'تعارف وتمہید' سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے پروفیسر عثمانی سے نہ صرف بھرپور استفادہ کیا ہے بلکہ وہ بالائی سے گھی کشید کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب معصوم مرادآبادی صاحب کی کتاب 'پروفیسر محسن عثمانی ندوی کی تصنیفات: اہل علم و ادب کی نظر میں' منظرعام پر آئی تو عبدالرحمٰن پاشا کو یہ احساس ہوا کہ ''ارباب علم وادب کی ثناخوانی کے درمیان ان کی بنیادی فکر کہیں دَب گئی ہے۔'' شاید اسی احساس کی وجہ سے عبدالرحمٰن پاشا نے پروفیسر محسن عثمانی ندوی سے جون 2024 میں ایک تفصیلی انٹرویو لیا۔ عبدالرحمٰن پاشا کے بقول ''عثمانی صاحب کے نظریات کو جاننے کے لیے اب اس انٹرویو کی کلیدی اہمیت ہے۔''

اس مختصر کتاب کے مرتب نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے پروفیسر محمد فہیم اختر ندوی کا 'خاکہ' بھی کتاب میں شامل کیا ہے۔ پروفیسر محسن عثمانی ندوی کے بارے میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''محسن عثمانی صاحب بزرگوں میں بزرگ، جوانوں میں جوان، خرقہ پوشوں میں صاحبِ دل، مسندنشینوں میں منصب کے حامل، علما و مشائخ کے منظور نظر اور چھوٹوں پر شفقت کے پیکر ہیں۔ مسلک ومشرب کی حدبندیوں سے بالا اور جدید وقدیم کے مصنوعی فرق سے نالاں ہیں۔ معاصر معروف مفکرین کے وہ قدرداں بھی ہیں اور امت کی ضرورتوں کے تناظر میں انصاف پسند ناقد بھی۔ وہ ان مفکرین کو یہ کہتے ہوئے خطاب کرتے ہیں:

خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سُن لے''

انٹرویو سے قبل پروفیسر محسن عثمانی کی ایک خودنوشت 'مرے قلم کا سفر: منزل بہ منزل' بھی شامل کتاب ہے۔ یہ آپ بیتی اپنی اہمیت کے سبب کئی کئی کتابوں اور رسائل کی زینت بنی ہے۔ لیکن اس مختصر 'آپ بیتی' میں پروفیسر محسن عثمانی ندوی نے اپنے قلم کا سفر دلآویز انداز میں پیش کرتے ہوئے جہاں اپنے بچپن اور جوانی کے مخفی گوشوں سے پردہ اٹھایا ہے وہیں ان کی ناقدانہ نظر علما اور دانشوروں کی قلمی، ادبی اور علمی کاوشوں کی باریک بینی سے جائزہ لیتی ہے۔ ایک زمانے میں پروفیسر عثمانی

صفحات: 48 قیمت: -/100 اشاعت: 2024
ناشر: ہیومن ویلفیئر کونسل، D-9/2 تیسری منزل، ملّی ٹائمز اسٹریٹ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025
Mobile: 9000018291

کا خاص تعلق خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے بھی رہا ہے۔لیکن لائبریری کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار کا تذکرہ اس آپ بیتی میں بڑی اپنائیت سے کیا گیا ہے۔ پروفیسر عثمانی لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر عابد رضا بیدار کو کتاب سے اور کتاب خانہ سے والہانہ محبت تھی، ہر وقت اس کی ترقی اور توسیع کی فکر، وہ خود محنت کرتے تھے اور لائبریری میں کام کرنے والوں کو محنتی اور ایمان دار دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ لائبریری میں کام کرنے والوں میں وہی صفات پیدا ہو جائیں جو اُن کے اندر ہیں، وہی فرض شناسی وہی ایمان داری، انہوں نے لائبریری کو ایک مُردہ خانے یا میوزیم سے ایک زندہ و تابندہ علمی ادارہ سے بدل دیا تھا، چمن میں بہار آ گئی تھی، گلشن سے خزاں رخصت ہو گئی تھی...''

اس مختصر کتاب کے آخر میں پروفیسر محسن عثمانی ندوی کا تفصیلی انٹرویو شامل ہے۔ اس انٹرویو میں اصل خاص بات یہ ہے کہ دورانِ گفتگو عبدالرحمٰن پاشا نے کرید کرید کر پروفیسر عثمانی کے افکار، خیالات اور حالاتِ حاضرہ پر ان کی آرا اور موقف کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ علامہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، علامہ ابوالحسن علی ندوی اور 'مفکر عصر' وحیدالدین خاں کے بارے میں عثمانی صاحب نے اپنے نکتہ نظر سے آگاہ کیا ہے۔

عثمانی صاحب جماعت اسلامی کے متعلق دارالعلوم دیوبند (حسین احمد مدنی گروپ) کے طرزِ عمل کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ البتہ ان کا کہنا ہے کہ دیوبند میں ایک دوسرا حلقہ بھی ہے۔ یہ ممتاز عالم دین قاری طیب صاحب کا حلقہ ہے، انہوں نے کبھی جماعت کے سلسلے میں یہ زبان استعمال نہیں کی۔ ان کے بلند مقام صاحبزادے مولانا سالم صاحب جماعت اسلامی کے جلسہ میں بھی شریک ہوتے تھے۔ وحیدالدین خاں صاحب کے بارے میں پروفیسر عثمانی صاحب کے موقف میں انقلابی تبدیلی آئی ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''وحیدالدین خان مفکر تھے لیکن ان کے بہت سے افکار غلط تھے، وہ ایک بڑے مصنف تھے لیکن ایک مثالی اسلامی شخصیت کے مالک نہیں تھے، ایک دینی و اخلاقی رہنما کے لیے کچھ اور بھی اوصاف کی ضرورت ہوتی ہے، صرف جلیل القدر مصنف ہونا کافی نہیں ہے۔''

'حالات بدل سکتے ہیں' کے مصنف پروفیسر محسن عثمانی ندوی 'کاروانِ ادب' کے ایڈیٹر بھی رہے لیکن ملک کی موجودہ صورت حال میں وہ عبدالرحمٰن پاشا کے سوال کے جواب میں کہتے ہیں کہ ''مدت ہوئی ہندوستانی مسلمانوں کے موت و زیست کا مسئلہ درپیش ہے، اس کشتی کو ساحل نجات تک کیسے لایا جائے؟ ذہن اسی میں الجھا رہا، ایسی حالت میں مجھ سے ادب کی بانسری نہیں بجائی جاتی، اس ملک میں مسلمانوں کا مستقبل کیا ہے اور ماضی میں ہم نے کیا غلطیاں کی ہیں، یہ موضوع دل و دماغ پر اتنا چھایا رہا کہ گزشتہ کئی سالوں سے قلم سے جو کچھ نکلا اسی موضوع پر نکلا...''

برادران وطن کے تعلق سے ایک سوال کے جواب میں پروفیسر عثمانی صاحب کہتے ہیں ''برادرانِ وطن تک اسلام کا پیغام پہنچانا فرض ہے، لیکن اس سے پہلے اپنے بلند کردار سے ان کی نظروں میں خود کو پسندیدہ شخصیت بنانا ضروری ہے۔ پہلے اپنے اخلاق و کردار سے اپنے کو اچھا مسلمان ثابت کرنا ضروری ہے۔''

'لسانِ قوم' پروفیسر محسن عثمانی صاحب کی ایک اہم مختصر کتاب ہے جس میں انہوں نے مدارس اسلامیہ اور علمائے کرام کی 'خبر' لی ہے۔ اس حوالے سے جب عبدالرحمٰن پاشا نے دریافت کیا تو پروفیسر عثمانی یوں گویا ہوئے:

''اللّٰہ تعالیٰ نے دنیا میں جتنے پیغمبر بھیجے ہیں، سب کے سب بلا استثنا وہ اپنی قوم (مشرکین و کفار) کو قوم کی زبان میں خطاب کرتے تھے۔ اس کے باوجود ہم نے ہندوستان میں سینکڑوں مدارس قائم کیے، ہر مدرسہ صرف لسان المسلمین کا مدرسہ بن کر رہ گیا ہے۔ لسان قوم کا ایک بھی مدرسہ نہیں ہے، یعنی وہ مدرسہ جس میں پڑھنے والے برادرانِ وطن کو خطاب کرنے والے بن سکے ہوں۔ ایسا ایک بھی مدرسہ نہیں قائم ہوا جہاں سے علما تیار ہوں جو قوم کی زبان جانتے ہوں اور اس میں تقریر و تحریر کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ قوم کی زبان کو اختیار کرنا پیغمبرانہ صفت ہے۔''

'لسانِ قوم' نام کی یہ کتاب یقینی طور پر نہ صرف قابل مطالعہ بلکہ فکر انگیز اور چشم کشا ہے۔

پروفیسر محسن عثمانی صاحب انٹرویو کے دوران میں یہ بھی کہتے ہیں کہ ''مولانا ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت بہت بڑی شخصیت تھی۔ انہوں نے بار بار اپنی تقریروں میں کہا تھا کہ اگر

اس ملک کے قدیم باشندوں تک یعنی برادرانِ وطن تک اگر دین اسلام کو نہیں پہنچایا گیا تو یہ ملک اسپین بن جائے گا، یہ معمولی بات نہیں ہے۔ یہ بہت ہی غور وفکر کی بات ہے، یہ دلوں کے لیے فکر واضطراب کی بات ہے۔ اس سے راتوں کی نیند اُڑ جانی چاہیے، لیکن تعلیم یافتہ طبقہ غفلت اور بےشعوری کی حالت میں ہے۔''

اس مختصر کتاب کے مطالعہ سے پروفیسر محسن عثمانی ندوی کی شخصیت سے شناسائی بھی ہوتی اور ان کے فکر انگیز خیالات اور پیغام کو محسوس بھی کیا جاسکتا ہے۔ شاید موصوف کی بات کسی کے دل میں اُتر جائے۔

□□□

خطیب اعظم: حیات اور خدمات

مصنف: ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی

تبصرہ: ریاض احمد قادری☆

زیر تبصرہ کتاب مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ رامپور کے ترجمان ماہنامہ 'ضیائے وجیہ' کا ایک خاص شمارہ بعنوان 'خطیب اعظم نمبر' ہے، جو دارالسرور رامپور کی ایک ذی علم شخصیت ابوالبیان (مولانا) وجیہ الدین احمد خان قادری مجددی رحمہ اللہ کی زندگی کے حالات، ان کی علمی اور تدریسی وتصنیفی خدمات اور ان کی فکری خصوصیات پر مشتمل ہے۔ اس خاص شمارہ کے فاضل مرتب ڈاکٹر شعائر اللہ خان، مولانا مرحوم کے نواسے اور ان کی علمی میراث کے محافظ ونگہبان ہیں۔ انہوں نے آٹھ مختلف عنوانات کے تحت ماہنامہ ضیائے وجیہ کا 'خطیب اعظم نمبر' شائع کر کے نہ صرف اپنے مخدوم مکرم اور جدامجد کو خراج عقیدت و محبت پیش کیا ہے، بلکہ مولانا مرحوم کے ارادت مندوں اور شاگردوں کے لیے ایک گراں مایہ تحفہ فراہم کیا ہے۔

روہیل کھنڈ کے مرکزی علاقہ رامپور کو نواب فیض اللہ خان

صفحات: 696   قیمت:-/1000   اشاعت: نومبر 2022
ناشر: دفتر ضیاءِ وجیہ، مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ،
بازار مسٹن گنج، رامپور-244901 (اتر پردیش)
Mobile: 9412364111 - 9997364111

کے عہد میں باقاعدہ ریاست کا درجہ حاصل ہوا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ نواب فیض اللہ خان (و:1794) نے 1775 میں اپنے نام پر ایک شہر فیض آباد کی بنیاد رکھی، جسے بدل کر مصطفی آباد کردیا گیا، پھر اسے ریاست کا درجہ دے کر رامپور کہا جانے لگا۔ مختلف علاقوں کے روہیلہ پٹھان یہاں آکر آباد ہو گئے۔ نواب فیض اللہ خان کی علم دوستی کے باعث رامپور مختلف فنون کے ماہرین کا مرکز بن گیا۔ انہی کی بدولت یہاں ایک مشہور تعلیمی ادارے کا قیام عمل میں آیا جو مدرسۃ العالیہ (رامپور) کے نام سے برصغیر میں مشہور ہوا جسے متحدہ ہندوستان کی قدیم ترین مشرقی یونیورسٹی قرار دیا گیا۔ مدرسہ عالیہ کے تمام اخراجات ریاست کی جانب سے پورے ہوتے تھے۔

رامپور کی سرزمین جسے بخارائے ہند بھی کہا گیا تھا، علم و ادب کے معاملہ میں ہمیشہ بڑی زرخیز رہی ہے۔ یہاں متعدد قابل ذکر علمی شخصیتیں پیدا ہوئیں، نیز مختلف علوم وفنون کے ماہر اُن بیرونی فضلا کو بھی اپنی آغوش میں جگہ دی جنہوں نے اپنے وطن سے ہجرت کر کے رامپور میں سکونت اختیار کرلی، پھر وہ بھی رامپوری کہلائے۔ فخر العلما علامہ فضل حق رامپوری (یہ وقت کے متبحر فاضل اور عالم بے بدل تھے، سلسلۂ خیرآباد کی ایک روشن کڑی تھے، اور ان کی علمی فضیلت مسلم تھی)، مولانا ہدایت اللہ رامپوری، مولانا منور علی محدث رامپوری، مولوی غیاث الدین رامپوری (مؤلف غیاث اللغات)، مولانا ارشاد حسین مجددی رامپوری، شاہ احمد سعید مجددی رامپوری، ملا محمد حسن فرنگی محلی، مولانا عبدالعلی منطقی، منشی امیر احمد امیر مینائی لکھنوی (مؤلف امیر اللغات) حکیم بایزید، مفتی محمد سعداللہ مرادآبادی ثم رامپوری، مفتی لطف اللہ رامپوری اور مولانا امتیاز علی خان عرشی رامپوری وغیرہ جیسے کاملان فن کا تعلق رامپور کی سرزمین سے رہا، یہ تمام فضلا اپنے عہد میں یگانہ اور فرد وحید تھے۔

بیسویں صدی عیسوی میں رامپور کی علمی فضا جن افراد سے خوش گوار و معطر رہی ان میں ایک نمایاں شخصیت (مولانا) شاہ وجیہ الدین احمد خان قادری مجددی رامپوری کی بھی ہے۔ مولانا مرحوم روشن دل اور روشن ضمیر وجود کے مالک تھے۔ ان کی وجیہ شخصیت، ان کا علمی وفکری وجدان وشعور اور افکار ونظریات

میں اعتدال کی روش کی بنا پر ان میں حنیفاً مسلماً کی جھلک نظر آتی تھی۔ مولانا کا مزاج خانقاہی تھا اس لیے مشائخ و اولیاء کے معمولات کو کارِ خیر سمجھ کر ان پر ہمیشہ کاربند رہے۔ شرارتی عناصر نے کلکِ خونخوار و برق بار سے وار کر کے مولانا کی چارِ عزت کو اتارنے کی حماقت بھی کی لیکن انہوں نے چابکدستی سے وار بچایا، تہذیب و شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مشائخ کی روش اعتدال پر قائم رہے اور اپنے مخالف گروہ کی قولاً یا فعلاً کبھی دلآزاری نہیں کی۔

(مولانا) وجیہ الدین احمد خان قادری مجددی رامپوری کی ولادت 1899 میں رامپور کے ایک پٹھان خاندان میں ہوئی جس کا تعلق افغانستان کے یوسف زئی قبیلہ سے تھا۔ انہوں نے گھر کے دینی ماحول میں پہلے قرآن حکیم پڑھنا سیکھا، پھر دس سال کی مختصر سی عمر میں حفظ قرآن مکمل کرلیا۔ مشہور عالم مفتی سلامت اللہ نقشبندی مجددی کی نگرانی میں فارسی و عربی کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ رامپور کے ایک باکمال استاد (مولانا) شاہ وزیر محمد خان مجددی رامپوری مدرسہ عالیہ میں مدرس تھے۔ والد گرامی نے اپنے بیٹے کو وہاں داخلہ دلوایا، ولدِ سعید نے مولانا کی خدمت میں رہ کر علمی اکتساب کیا اور مدرسہ عالیہ درس نظامی کی تکمیل کے بعد ۱۳۳۹ھ (1921) میں فضیلت کی سند حاصل کی۔ اپنے استاد کے مشورہ سے علم حدیث کی تکمیل کے لیے دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا جہاں محدث عصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ شیخ الحدیث تھے اور ان کے درس کا غلغلہ سارے ہندوستان میں تھا۔ مولانا مرحوم نے حضرت محدث کشمیری کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا، ان کے حلقۂ درس میں 9 ماہ گزار کر ۱۳۴۰ھ (1922) میں دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد سند حدیث حاصل کر کے رامپور لوٹ آئے۔ متعدد مدارس میں تدریسی خدمت انجام دی۔ بالآخر 1936 میں مادر علمی مدرسہ عالیہ میں مدرس ادب کے عہدہ پر تقرر ہوا اور 1957 میں سبکدوش ہوئے۔ ریاست رامپور کی معزولی اور مدرسہ عالیہ کی زبوں حالی سے مولانا مرحوم بے حد ملول تھے۔ چنانچہ ملازمت کے دوران ہی 1950 میں انہوں نے ایک دینی ادارہ 'مدرسہ فرقانیہ' کی بنا ڈالی، جہاں اسلامی تعلیمات کے ساتھ عصری تعلیم کا بھی معقول انتظام کیا۔ چند سالوں میں اس ادارہ نے بہت ترقی کی اور 1960 میں اس ادارے کو 'جامع العلوم فرقانیہ' کا نام حاصل ہوگیا۔ آج یہ ادارہ مولانا کی یادگار ہے۔

(مولانا) وجیہ الدین احمد خان (رحمہ اللہ) کے معتقدین کے نزدیک وہ ایک باعمل عالم، کامیاب معلم، نامور خطیب، بہترین سخنور اور باشعور منتظم تھے، مجھے اس کی تائید میں کوئی تامل نہیں۔ لیکن میرے نزدیک مولانا مرحوم کا امتیازی وصف مسلک سے متعلق ان کی معتدل روش ہے۔ اس پُرفتن دور میں جہاں ایک طرف سے شرک و بدعت کے فتوے جاری ہوتے ہیں، اور دوسری جانب سے کفر کی میزائلیں داغی جاتی ہیں۔ ہر جماعت فساد فی العقیدہ میں مبتلا اور دوسرے مسلک کے خلاف محاذ آرائی کر کے اس کے ماننے والوں کو دائرۂ اسلام سے خارج کرنے پر آمادہ ہے۔ ایسے پُرآشوب زمانے میں مولانا مرحوم نے تشدد فی الدین کی بیخ کنی کے لیے 'مسلکِ اربابِ حق' جیسی کتاب تالیف کی اور اس کتاب کے ذریعہ مسلمانوں میں الفت و محبت اور اعتدال کی راہ ہموار کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔ یہ کتاب الدین النصیحة کی آئینہ دار ہے اور تصنیف و تالیف کے ضمن میں ان کا قابل قدر کارنامہ ہے۔ ان کی دیگر تصنیفات کا ذکر بھی متعدد مضامین میں آیا ہے لیکن ان کتابوں تک میری رسائی نہیں ہوئی ہے۔

اس خاص نمبر میں شامل پروفیسر نثار احمد فاروقی (مرحوم)، ابوذر عبدالاحد فرقانی، صحافی شمیم طارق (بنارسی)، (مولانا) شاہ بدر احمد قادری مجیبی، (مولانا) شاہ ہلال احمد قادری مجیبی (مرحوم) اور ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم صاحبان کے مؤقر مضامین یقیناً لائق مطالعہ ہیں۔ پروفیسر مفتی زاہد علی خان، سابق صدر شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) اور پروفیسر سیّد فضل اللہ قادری کا مضمون بھی لائق مطالعہ ہے۔ اس مجموعہ میں شامل ایک باب جو 'تصانیف خطیب اعظم' کے تجزیہ و تبصرہ سے متعلق ہے، بہت معلوماتی ہے۔ اس کا مطالعہ کرنے سے مولانا مرحوم کی جملہ تصنیفات و تالیفات کا بخوبی علم ہوجاتا ہے۔ مولانا مرحوم ذوق سخن سے بھی آشنا تھے اور ان کے کلام کا مجموعہ 'دیوان وجیہ' کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ متعدد خوبیوں کے مالک (مولانا) وجیہ

الدین احمد خان نہ صرف رامپور بلکہ ملک کے مختلف علاقوں میں مقبول تھے۔ بالخصوص ان کی خطابت سے عوام اور خواص سب ہی مستفید ہوتے تھے۔ میرے شہر بنارس میں بھی کئی مرتبہ ان کے خطابات ہوئے اور متعدد لوگوں کے دلوں میں ان کی تقریر کا نقش آج بھی قائم ہے۔

مولانا مرحوم سے منسوب اس ضخیم شمارہ میں جو بات سب سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ مضامین کی تکرار ہے۔ خاص شمارہ کا مقتضا تھا کہ متفرق عنوانات کا تعین کر کے چیدہ مضمون نگار حضرات کو دعوتِ نگارش دی جاتی اور مبتدی کے مضامین سے خاص نمبر کی ضخامت میں اضافہ نہ کیا جاتا تو'خطیب اعظم نمبر' کی افادیت میں اضافہ ہوجاتا۔ اس کے باوجود ڈاکٹر شعائر اللہ خان صاحب کے عزم و ہمت کی داد دینا لازم ہے کہ بڑی محنت ومشقت کے ساتھ ایک یادگار مجموعہ مرتب کر کے ناظرین کے سامنے پیش کیا ہے۔ اللہ کرے اسے قبول عام حاصل ہو۔

☆ مبصر سے رابطہ: موبائل: 9839878316 (وارانسی، یوپی)

❑❑❑

بٹوارا۔ کہانی ایس پی سنگھ او برائے

مصنف: پروفیسر سریندر سنگھ
مترجم: پروفیسر مظفر علی شہ میری
تبصرہ: پروفیسر (ڈاکٹر) محمد سلیم قدوائی☆

تقسیم ہند ایک ایسا موضوع ہے جس پر ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دانشوروں نے کثرت سے طبع آزمائی کی ہے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ زیر تبصرہ کتاب بٹوارا جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے تقسیم ہند کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ یہ ناول اصل میں پنجابی زبان میں تحریر کیا گیا تھا اور اس کے ترجمے کئی زبانوں میں کیے گئے ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ پروفیسر مظفر علی شہ میری نے کیا ہے جن کو ترجمہ کا خاصا تجربہ ہے۔

صفحات:120 (مجلد) قیمت: درج نہیں اشاعت:2018
ناشر: سربت ڈا بھلا چیریٹیبل ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، پٹیالہ، پنجاب

یہ ناول دو حصوں میں منقسم ہے۔ ہمارے پیش نظر پہلا حصہ ہے جس میں برصغیر کی تقسیم تک کے حالات کا جائزہ لیا گیا ہے اور مصنف کے خاندانی پس منظر کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ تقسیم ہند بلاشبہ تاریخ کا ایک ایسا المیہ ہے جس کے نتیجے میں صدیوں کی رواداری اور وضع داری خاک میں مل گئی۔ تقسیم ہند نے کس طرح عوامی زندگی کو متاثر کیا اس کا اظہار اس ناول میں بخوبی ملتا ہے۔ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے زوال کا ذکر بھر پور انداز میں کیا گیا ہے۔ تقسیم کا اعلان ہوتے ہی دونوں طرف مسائل در مسائل کھڑے ہوئے، لاکھوں کی آبادی ادھر سے ادھر ہجرت کرنے پر مجبور ہوئی، بے شمار لوگوں کی جانیں گئیں اور ان گنت لوگوں کے گھر بار چھوٹے۔ کسی تصنیف کا اپنے آغاز سے ہی گرفت میں لے لینا سب سے بڑی خوبی مانی جاتی ہے اور یہ ناول اس کسوٹی پر پورا اترتا نظر آتا ہے۔ کرداروں کے مکالموں میں ان کی سماجی حیثیت میں مناسبت رکھنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ یہ ناول اس قدر دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے کہ دوران مطالعہ یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ شدہ ہے۔ ترجمہ سلیس اور شگفتہ عبارت میں لکھا گیا ہے اور اصل کی لفظی رعایت کے ساتھ اسلوب بیان کی روانی اور شگفتگی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ ترجمہ کی زبان آسان اور بامحاورہ ہے۔ ناول میں مثبت اور تعمیری نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ مصنف نے انسانی بھائی چارے، محبت و اخوت کا پیغام دیا ہے۔ اس کتاب کا پیغام یہ ہے کہ تقسیم اس مشترکہ تہذیب کی تھی اور تنسیخ نہیں کرتی جو پورے برصغیر کی رہی ہے۔ اس ناول میں انسانی دردمندی نظر آتی ہے۔ حکمرانی بدلتی رہتی ہے لیکن تہذیب وتمدن جو صدیوں میں پروان چڑھتے ہیں ان کا تحفظ ضروری ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک دلچسپ اور قابل مطالعہ ناول ہے اور اس کا مقصد برصغیر کے امن وسلامتی کو برقرار رکھنا ہے۔ موجودہ دور میں اس طرح کی کتابوں کی اہمیت اور معنویت اور بڑھ جاتی ہے۔ طباعت عمدہ ہے۔ اس ناول کے مصنف اور مترجم دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

☆ مبصر کا پتہ: C-501، روزوڈس اپارٹمنٹ، میورو ہارا،
نئی دہلی-110091_Mobile: 9953529424
E-mail: mskidwai@hotmail.com

❑❑❑

اسرار احمد: حیات و خدمات

مرتب: ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں

تبصرہ: ابراہیم افسر☆

ارضِ رام پور کی تاریخی، سماجی و ادبی خدمات سے کون واقف نہیں۔ اس سرزمین میں اُردو ادب کے بے لوث خادم پیدا ہوئے۔ یہاں کے تعلیمی اداروں سے نکلے تعلیم یافتہ لوگوں نے ملک و سماج کو متاثر کیا ہے۔ رام پور کا گورنمنٹ حامد اسکول ایک ایسا ادارہ ہے جس میں ملک کے سرکردہ رہنماؤں اور فن کاروں نے تعلیم حاصل کی جن میں محمد علی جوہر اور رضا مراد کا نام قابلِ ذکر ہے۔ انھی خادمان اُردو میں ایک نام اسرار احمد (سابق پرنسپل، گورنمنٹ حامد اسکول رام پور) کا ہے۔ انہوں نے سائنس کے میدان کو خیرباد کہہ اُردو کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ حالاں کہ ان کے مضامین میں سائنس کی زیادہ باتیں ہیں جو طلبا کے لیے کسی بیش قیمت خزانے سے کم نہیں۔ ان کے مضامین، ضیاء وجیہ، روز نامہ رام پور کا اعلان، آئینہ اُردو اور آکاش وانی رام پور میں شائع و نشر ہوئے ہیں۔ اسرار صاحب نے شہر رام پور میں تعلیم کے میدان میں خاطر خواہ کارنامے انجام دیے ہیں۔ رام پور کی ادبی محفلوں میں شامل ہونا ان کا اولین فرض ہے۔ سید حامد صاحب کے تعلیمی مشن ''یو پی رابطہ کمیٹی'' کے اسرار احمد ایک اہم رکن رہے۔ انہوں نے 2002 میں Symbiosis Public School قائم کیا۔ ان کی تعلیمی خدمات کے مدنظر انہیں Euro Asian University نے Peace Ambassador کی اعزازی سند تفویض کی ہے۔ موصوف ہمیشہ طلبا کے تعلیمی مسائل کا تدارک کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اسرار احمد اپنے ہم عصروں میں 'پھول میاں' کے نام سے مشہور ہیں۔ درحقیقت 'اسرار' کا 'پھول' بن جانا ہی ان کی قدر و منزلت میں چار چاند لگاتا ہے۔

صفحات: 530 قیمت:-/1000 اشاعت:2024
ملنے کا پتا: غوث منزل، تالاب ملّا اِرم، رامپور - 244901
Mobile: 9520576079

اسرار احمد اپنے شاگردوں کے لیے مثالی اُستاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے شاگردوں میں ایک اہم نام ڈاکٹر اطہر مسعود خاں کا ہے۔ اطہر مسعود خاں نے زیر نظر کتاب میں اپنے استاد کی مثالی شخصیت، حیات اور سماجی و ادبی خدمات کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ اطہر مسعود خاں نے اس کتاب کا ڈول 2006 میں ڈالا تھا لیکن بعض وجوہات کی بنا پر 2024 میں یہ کتاب منظر عام پر آئی ہے۔ انہوں نے اپنے استادِ محترم پر نہ صرف خود مضمون لکھا بلکہ اسرار صاحب کے اہلِ خانہ کے علاوہ دیگر سرکردہ ادیبوں سے بھی مضامین لکھوائے۔ عمومی طور پر ہم اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ کتاب کے پہلے حصے میں 48 اہل قلم نے اسرار احمد کی حیات و شخصیت پر ہندی، اُردو اور انگریزی میں مضامین سپردِ قلم کیے۔ دوسرے حصے میں دو نظمیں شامل ہیں جن میں اسرار احمد کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے تیسرے حصے میں خود اسرار احمد کے لکھے ہوئے 38 مضامین شامل ہیں۔ اکثر اُردو کتابوں کے تمہیدی کلمات اُردو میں ہوتے ہیں لیکن ڈاکٹر اطہر مسعود خاں نے جسٹس ناہید آرا مونس کا انگریزی میں لکھا مقدمہ شاملِ کتاب کیا ہے۔ کتاب کا دوسرا مقدمہ خود صاحب مرتب نے رقم کیا ہے۔ ڈاکٹر مسعود خاں نے اپنے مقدمے میں اسرار احمد سے اپنے مراسم، ان کی نرم گفتاری، زبان دانی، پڑھانے کے انداز اور تعلیم کے تئیں ان کی سنجیدگی کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔

اسرار احمد نے مختلف موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے سائنسی موضوعات پر خوب لکھا ہے۔ ان سائنسی مضامین میں سائنس کی نئی ایجادات اور انسانی زندگی، کیوں تھکتا ہے ہمارا جسم، پلاسٹک: کتنا مفید کتنا مضر، کمپیوٹر: ایک حیرت انگیز ایجاد، پیس میکر: زندگی کی نئی کرن، جدید سائنس کی دوڑ اور بھارت، گنگا کی آلودگی اور ہمارا منصوبہ، بال سفید کیوں ہوتے ہیں، نلکی زادے (Test Tube Babies)، شمسی توانائی: ایک جائزہ، شور کا اثر سماعت پر: ایک تجزیہ، بحری سائنس میں بھارت کے بڑھتے قدم، خون کا تحفظ کس طرح، ماحولیاتی آلودگی کے خطرات: ایک چیلنج، بھارت اور خلائی تکنیک، بے خوابی: اسباب و علاج وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ در اصل

اسرار احمد نے اپنے سائنسی خیالات کو اُردو میں پیش کر کے قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ اب ایسے ادیبوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاتی ہے جو سائنس کو اُردو میں پیش کرر ہے ہیں۔ اسرار احمد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مختصر لیکن جامع سائنسی مضامین میں بچوں اور بزرگوں کو مخاطب کیا ہے۔ سادے اور عام فہم الفاظ میں اپنی بات مکمل کی ہے۔ سائنس کی اُردو اصطلاحات کو ان کے انگریزی متبادل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اسرار احمد نے شاعری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ انہوں نے اپنے دوستوں کے اصرار پر سہرے بھی لکھے اور افسانے بھی۔

ڈاکٹر اطہر مسعود خاں نے اپنے استاد کی سماجی، ملی اور ادبی شخصیت کو کتابی قالب میں پیش کرانہیں سچا خراج پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے منظرِ عام پر آنے سے رام پور کی نیک اور فعال شخصیت کے چند نمونے ہمیں دیکھنے کو ملے۔ ساتھ ہی یہ بھی جاننے کا موقع ملا کہ اسرار احمد جیسے لوگوں کی وجہ سے رام پور میں تعلیم و ادب کا وقار وافتخار بلند و بالا ہے۔ ان کے شاگردان آج ملک کی تعمیر وترقی میں اپنا کلیدی کرادارادا کرر ہے ہیں۔ اسرار احمد کی شخصیت اور تعلیمی خدمات کے حوالے سے کتاب میں شامل مضامین کو پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ ابھی لوگوں کے قلوب میں اپنے اسلاف کی قدر و قیمت باقی ہے۔ یہ بھی کہ استاد اور شاگرد کا رشتہ کتنا اہم اور پاکیزہ ہے۔ خود کتاب کے مرتب ڈاکٹر اطہر مسعود خاں نے جا بجا اس بات کا اظہار کیا کہ آج میں جو کچھ ہوں وہ سب میرے استاد یعنی اسرار احمد کی تعلیم وتربیت کا ثمرہ ہے۔ آخر میں راقم اسرار احمد جیسی نابغہ روزگار شخصیت کو علامہ اقبال کے شعر کے ساتھ خراج تحسین پیش کرتا ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

☆ مبصر کا پتہ: وارڈ نمبر 1، مہپا چوراہا، نگر پنچایت سِوال خاص، ضلع میرٹھ— 250501 (یوپی) موبائل 9897012528

□□□

اردو کی حقیقی ترقی ھی
اردو کی معراج ھے

سیوان کی ادبی تاریخ

مصنف: ڈاکٹر ارشاد احمد

تبصرہ: زینب حسن انصاری☆

ڈاکٹر ارشاد احمد (پ:25 جنوری 1968) اردو ادب کا شناسا نام ہے۔ ان کی بیشتر تحریریں علاقائی ادب پر محیط ہیں۔ ڈاکٹر ارشاد انڈین ریلوے میں لوکو پائلٹ میل کے عہدے پر فائز ہیں۔ اس ذمہ داری کو بہ حسن وخوبی ادا کرنے کے ساتھ ان کے مضامین تواتر سے قومی سطح کے مقتدر رسالوں میں شائع ہوتے ہیں۔ اردو ادب میں تحقیق وتنقید، خاکہ نگاری، سوانح نگاری اور تبصرہ نگاری کے شعبے میں ان کے کارنامے لائق تحسین ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی ان کا قلم رواں دواں ہے۔ ابھی تک ان کی آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں ہندی کی تین کتابیں شامل ہیں۔

پیش نظر کتاب 'سیوان کی ادبی تاریخ' ڈاکٹر ارشاد احمد کی تازہ تصنیف ہے۔ اس کتاب سے قبل سیوان کی ادبی تاریخ پر کوئی مستند، جامع اور مفصل کتاب نہیں ملتی۔ قدیم تذکروں میں سیوان سے تعلق رکھنے والے جن قلم کاروں کا ذکر ہے انہیں سارن ضلع کا ساکن بتایا گیا ہے۔ 1972 میں سیوان الگ ضلع بنا۔ آج پچاس سال کا زمانہ گزر گیا لیکن قدیم ادبا و شعرا کو سارن کا ہی لکھا جاتا ہے۔ مصنف نے سیوان کے قلم کاروں کو سارن سے الگ کر کے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

سیوان کی ادبی تاریخ میں الگ الگ عنوان پر کل بارہ مضامین شامل ہیں۔ عرض مصنف کے تحت ڈاکٹر ارشاد احمد نے ان عوامل واسباب کا تذکرہ کیا ہے جن کی وجہ سے یہ کتاب معرض وجود میں آئی۔ چونکہ مصنف ضلع انتظامیہ کے ذریعہ تشکیل کردہ 'ضلع گزیٹیر نرمان سمیتی' کے ممبر ہیں اس لیے انہوں نے سیوان ضلع کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے مواد کی فراہمی کے لیے قریہ قریہ کا

صفحات: 160 قیمت:-/450 اشاعت:2024
ناشر: صغریٰ میموریل پبلک لائبریری، 1731 آمنہ منزل، اسلامیہ نگر، سیوان-841226 (بہار) Mob: 9771443219

سفر کیا اور مختلف شہروں کی خاک چھانی۔ اس کے بعد جن لعل و گہر اور گوہر گم گشتہ سے ان کا سابقہ پڑا یہ کتاب انہی قلم کاروں کی سوانح اور ادبی کارگزاریوں کا نگارخانہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''فیلڈ ورک میں میں نے پچاس پچاس کیلومیٹر کی مسافت طے کی۔ اس دوران ہمیں نئے نئے تجربات اور دلچسپ واقعات کا سامنا کرنا پڑا۔ تخلیق کار کے دروازے تک پتہ پوچھ پوچھ کر پہنچنا ایک مشکل اور وقت طلب کام تھا۔ کسی طرح وہاں پہنچ گئے تو ورثا کا ناز ونخرہ قابل دید ہوتا تھا۔ ان کو لگتا تھا کہ میرے پاس کوئی بیش قیمتی خزانہ ہے جو یہ لینے آئے ہیں۔'' (ص:6)

اس کتاب کا دوسرا مضمون 'ضلع نامہ سیوان' ہے۔ اسے سیوان کا انسائیکلو پیڈیا کہہ سکتے ہیں۔ اس میں سیوان کی وجہ تسمیہ، کل رقبہ، آبادی، بولیاں، ندیاں، پارلیمانی حلقہ، مواضع اور بلاک کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قدیم زمانے سے عہد حاضر تک کی صنعت و حرفت، تجارتی مقامات اور مختلف ادوار کے راجاؤں کی حکومت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلے میں تاریخی وتفریحی و مذہبی مقامات اور خانقاہوں کی بھی تفصیلی جانکاری مل جاتی ہے۔

تحریک آزادی میں شامل صفِ اوّل کے رہنما برج کشور پرشاد، بیرسٹر مظہر الحق، ڈاکٹر راجندر پرشاد، نرائن بابو اور پربھاوتی دیوی کا تعلق سیوان سے تھا۔ یہ قومی رہنما تحریک آزادی میں پیش پیش رہنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے سماج اور معاشرے کی اصلاح کا بھی کام کیا۔ پربھاوتی دیوی نے اپنی پوری زندگی گاندھی جی کے ہمراہ سابرمتی آشرم میں گزار دیا۔ مصنف نے سیوان کی علمی دانش گاہوں پر بھی قلم اٹھایا ہے اور انجینئرنگ کالج، ٹیچرس ٹریننگ کالج، موسیقی کالج کی تفصیلی جانکاری دی ہے۔ آج کم لوگوں کو معلوم ہے کہ چترگپت، ابو سیوانی، ونے سنہا، آمود سنہا، اکھلیند رمشرا اور آنند ملند جیسی معروف فلمی ہستیوں کا مسکن سیوان ہے۔

جہاں ایک طرف سیوان میں اردو ادب کی ابتدا، ارتقائی سفر اور موجودہ صورتحال پر ڈاکٹر ارشاد احمد نے چار مفصل، بسیط اور جامع مضامین تحریر کیے ہیں وہیں انہوں نے ہندی اور بھوجپوری ادب پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ مصنف کے مطابق سیوان میں کتابوں کا اشاعتی سلسلہ 1908 میں شروع ہو گیا اور 1897 میں سیوان کے کھجوہ سے جاری ہونے والا رسالہ آج بھی نہایت پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے تقریباً 60 غزل گو شعرا کا تذکرہ ان کے سوانحی کوائف اور نمونۂ کلام کے ساتھ کیا ہے۔ ان کی تحریر کا انداز دیکھیں:

''سیوان کے غزلیہ منظر نامے کا ایک معتبر اور معروف نام فاروق سیوانی کا ہے۔ آپ کی غزلیں دلوں میں اتر جانے اور جسم و جاں کو معطر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ آپ کی غزلوں کا مجموعہ دریا ٹوٹ جاتا ہے اور ڈوبنے والے سمندر ہو گئے کے مطالعے کے بعد شاید ہی کوئی ایسا قاری ہو جو آپ کی غزل گوئی سے متاثر نہ ہوا ہو'۔ (ص:101)

ڈاکٹر ارشاد احمد نے 'سیوان میں تحقیق وتنقید: ایک بازدید' میں سید حسن عسکری، ڈاکٹر حسن مثنیٰ، ڈاکٹر محمد مظاہر الحق، پروفیسر عبدالبرکات، پروفیسر سید حسن عباس، ڈاکٹر ریحان حسن اور ڈاکٹر صابر علی سیوانی جیسے محققین و ناقدین کی ادبی خدمات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ یہ وہ شخصیات ہیں جو ملک گیر سطح پر اپنی علمی وادبی کارناموں کی بدولت پہچانی جاتی ہیں۔ کتابوں سے قوم کی دوری موجودہ دور کا خوفناک المیہ ہے۔ ڈاکٹر ارشاد احمد نے وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے سیوان کے معدوم کتب خانوں کی تفصیل بتائی ہے۔ اس ضمن میں مصنف کا بیان ہے کہ دیوان ناصر علی اور احمد جمال پاشا کے کتب خانوں میں نادر و نایاب کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ ان کے علاوہ سیوان کے مضافات میں کئی لائبریریوں کا وجود تھا، لیکن تمام کتب خانے برباد ہو گئے۔ احمد جمال پاشا کی کتابیں آج دیمک کی خوراک بنی ہوئی ہیں۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیوان کی ادبی تاریخ معلومات کا دریا ہے جس سے طلبا و طالبات، محققین و ناقدین، مبتدی و منتہی سبھی فیضیاب ہوں گے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب مرور زمانہ کے ساتھ حوالہ جاتی بن جائے گی۔ ڈاکٹر ارشاد احمد مبارکباد کے مستحق ہیں کہ تعلیمی دانش گاہوں سے باہر رہ کر اتنا بڑا تحقیقی وعلمی کارنامہ انجام دیا۔

☆ مبصر کا پتہ: ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، جے پی یونیورسٹی۔ چھپرہ، ضلع سارن (بہار) موبائل:7321838102
Email: drirshadahmad05@gmail.com

□□□

بدلتے معاشرتی اقدار اور عورت

مؤلفہ: شبنم آرا

تبصرہ: ریاض احمد قادری ☆

عورت ... نسل انسانی کی افزائش کا اہم ذریعہ اور ایک مستحکم معاشرے کی تعمیر کا مرکزی کردار ہے۔ عورت نے مرد کو جنا، اس کو اپنا دودھ پلا کر جسمانی اور ذہنی طور پر مضبوط کیا، اسے چلنے اور دوڑنے کی قوت فراہم کرنے میں مدد کی، اسے پال پوس کر اس لائق بنایا کہ کارزار حیات میں تگ و دَو کر سکے اور سعی پیہم کے ذریعہ اپنی قسمت کو اعلیٰ علّیین تک پہنچا سکے۔ عورت نے ایک مضبوط خاندان اور محفوظ معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے لیے پائیدار بنیادیں قائم کیں... ان تمام خدمات کا صلہ یہ ہونا چاہیے کہ عورت کے حقوق کا ہمہ وقت لحاظ رکھا جائے، اس کے ساتھ حسنِ سلوک اور اچھا رویہ اختیار کیا جائے، اس کی عزت و شان کو مجروح نہ ہونے دیا جائے، اس پر کسی قسم کی زیادتی یا اس کا استحصال ہرگز نہ کیا جائے، بلکہ مایۂ عزت قرار دے کر اس کی عصمت و آبرو کی ہر ممکن حفاظت کی جائے۔

ہاں!... یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر اہم کام میں عورت کے ساتھ مرد کی بھی شمولیت ضروری ہے، اور اس کے اشتراک کے بغیر عورت تنہا اپنے انسانی فرائض کو پورا کرنے کی سکت نہیں رکھتی۔ خانگی معاملات ہوں یا معاشرتی مسائل مرد و عورت دونوں کے باہمی تعاون، آپسی تال میل اور مشوروں سے ہمیشہ اچھے نتائج سامنے آئے۔

تاریخ کے اوراق اس بات کے شاہد ہیں کہ مرد نے اکثر عورت پر زیادتیاں کیں، اس کے جائز حقوق پر دست درازیاں کیں، اور اُسے اپنا مالِ مملوکہ سمجھا۔ لیکن یہ بھی حق ہے کہ مرد کی فطرت و سرشت میں عورت کی خاطر محبت و ہمدردی کے جذبات

صفحات: 220 قیمت: -/350 اشاعت: 2022
ISBN 978-81-960135-3-0
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، D1/16 انصاری روڈ،
دریا گنج، نئی دہلی-110002

بھی پنہاں ہیں۔ اسی محبت کا کرشمہ تھا کہ بعض اوقات عورت کے ہاتھ میں اقتدار کی زمام سونپ دی گئی اور پوری سلطنت اس کے اشاروں پر گردش کرتی رہی۔ وارانسی میں جنم لینے والی جھانسی کی رانی لکشمی بائی، مغل ملکہ نور جہاں، ملکہ رضیہ سلطانہ وغیرہ سے لے کر نیوزی لینڈ کی ڈیم جینیفر، میری شیلی اور جیسنڈا ایرڈرن، جرمنی کی اینجلا مرکل، سنگاپور کی حلیمہ یعقوب اور ماریشس کی امینہ غریب اس سلسلے کی چند قابل ذکر مثالیں ہیں۔ اس کے باوجود بحیثیت نوع عورت کے حالات میں کچھ زیادہ فرق نہ آیا۔ وہ پہلے بھی ظلم و جبر کا شکار رہی اور آج بھی وہ مظلوم ہی ہے۔

ہندومت کی مذہبی کتابوں کی دو تاریخی درجہ بندیاں ہیں: (۱) شروتی یعنی مسموعہ کتب یا روایات، ان میں مقدس ترین کتب چاروں وید ہیں جنہیں 'ایش وانی' یعنی ایشور یا دیوتاؤں کا کلام کہا جاتا ہے۔ (۲) سمرتی یعنی محفوظ روایات، ان میں اہم ترین کتب پُران اور اُپنشد ہیں، یہ ویدک عہد کے متون ہیں۔ ویدک عہد قدیم کے معاشرتی نظام میں عورت کو تمام برائیوں کی جڑ کہا گیا۔ اس عہد میں عورت موروثی جائداد کے حق سے بھی محروم تھی۔ پرانوں اور سمرتیوں کے دور میں عورت کو ناپاک قرار دے کر اسے تعلیم سے محروم رکھا گیا۔ ہندو فلاسفر منو کے دھرم شاستر میں عورت کو شیطان کی ایجنٹ اور شر و فتنہ کا مجسمہ کہا گیا کہ اسے اپنی خواہشات، بداطواری اور کمینہ پن سے لگاؤ ہوتا ہے، اور اسی لیے انہیں مقدس کتابیں پڑھنے کی بھی ہرگز اجازت نہ تھی۔

تہذیب و تمدن کے مراکز مانے جانے والے یونان و روم بھی عورت کو اس کا جائز مقام دینے سے قاصر تھے۔ عہد وسطیٰ کے یوروپ میں چرچ بہت بااثر مذہبی ادارہ ہوتا تھا۔ وہاں کے مسیحی پادری عورتوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ وہ اپنی مذہبی روایات کے تحت عورت کو گناہ اور بدی کا ذمہ دار گردانتے تھے۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں بیواؤں کی حالت بہت ہی نازک تھی۔ بیوہ ہو جانے والی بے اولاد بچیوں کو نیوگ کی رسم قبیح کے تحت اپنے دیور یا جیٹھ سے جسمانی تعلق استوار کر کے حاملہ ہونے کا موقع فراہم کیا جاتا۔ ایسے جاں سوز اور اذیت ناک حالات سے عاجز آ کر وہ اپنے شوہر کی چِتا کے ساتھ خودسوزی کرنا بہتر سمجھتی تھی جسے ستی ہونا کہا جاتا تھا۔ گویا عہد

قدیم سے چھٹی صدی عیسوی تک عورت ہر طرح مظلوم رہی اور مردوں کے استبداد و استحصال کا شکار رہی۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد ﷺ نے اپنے متبعین کو عورتوں کے جائز حقوق کی ادائی کا سبق سکھایا، اور ساری دنیا کے سامنے اس کی عملی شکل اور نمونہ بھی پیش کیا۔ ان کے لیے تعلیم کی راہیں ہموار کیں، ان کی مذہبی حیثیت کو اجاگر کیا، عورتوں سے متعلق معاشرے کے تصور و نظریات کو بدلا، وراثت میں ان کے حقوق متعین کیے، مثلاً عدل و توازن کے ساتھ مرحوم کی بیٹی، بیوی اور ماں کے حصے مقرر کیے اور انہیں عزت و وقار کا وہ مقام عطا کیا کیا جس کی وہ حقدار تھی۔

زیر تبصرہ کتاب صنف نسواں کی حیثیت اور نسوانی ادب سے متعلق شبنم آرا دہلوی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ملک کے مختلف اردو رسائل کی زینت بن چکے ہیں (کیا اچھا ہوتا کہ ہر مضمون کے اختتام پر رسالہ کا نام اور اشاعت کے ماہ و سال کا اندراج ہوتا)۔ کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے عورتوں کے حالات و مسائل کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے، نتیجتاً زمانۂ قدیم سے دورِ جدید تک عورتیں جس جبر وظلم شکار ہوتی رہیں اس سے ایک حد تک آگاہ ہیں۔ وہ خود صنفِ نسواں سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے بخوبی یہ بھی جانتی ہیں کہ عہدِنو کے ترقی یافتہ معاشرے میں بھی عورت کو کن آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے۔ انگریزی دور کے ہندوستان میں جب عورتوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر توجہ دی گئی تو سرسید اور ان کے رفقا نے اپنی تحریروں کے ذریعہ سماج کو بدلنے کی کوششیں شروع کیں، اس ضمن میں انہوں نے اپنے قلم کے ذریعہ عورتوں کے مختلف مسائل کو اجاگر کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر اور مصورِ غم راشدالخیری وغیرہ نے اپنی تخلیقات میں عورتوں کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلایا، ان کے اندر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ بیدار کیا اور سماج میں عورتوں پر جن ناانصافیوں کو جائز سمجھا جاتا تھا ان کی دردناک عکاسی کی۔ مرزا محمد ہادی رسوا نے اپنے ناول شریف زادہ اور دوسری تحریروں میں عورتوں کو خود کفیل بننے اور زندگی کی تگ و دو میں مرد کے شانہ بشانہ کام کرنے پر ابھارنے کی کوشش کی۔ پریم چند ایک ترقی پسند ادیب تھے اور مرد و زن کے درمیان مساوات کے حامی تھے۔ وہ سوامی وویکانند، مہاتما گاندھی اور مسز اینی بیسنٹ کی تحریکات وتعلیمات اور نظریات سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے سماج میں عورتوں کی دبی کچلی حیثیت کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ ان کے حساس دل نے صنف نسواں کی کرب انگیز زندگی بالخصوص دیہی سماج میں ان پر ہونے والے معاشی وجنسی مظالم کا عینی مشاہدہ کیا، اور ان کے خلاف اپنے ناولوں اور افسانوں میں آواز اٹھائی۔ سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، قاضی عبدالغفار، واجدہ تبسم اور آخر میں ترقی پسندوں کی آپا عصمت چغتائی نے عورتوں کے معاشی و معاشرتی مسائل اور مردوں کے ذریعہ کیے گئے ان کے استحصال کے منظر کو اپنی تحریروں میں پُرزور انداز میں پیش کیا اور حقیقت نگاری کی ایک نئی راہ قائم کی۔ لیکن سچ یہ بھی ہے کہ نذیر احمد، شرر، سرشار، رسوا اور راشدالخیری کی تحریروں میں متانت، سنجیدگی اور شائستگی ہے۔ ان کے مقابل منٹو، بیدی اور بالخصوص عصمت چغتائی وغیرہ کی تحریروں میں ابتذال، ناشائستگی، رذالت اور ان کی فکر میں روشن خیالی کے نام سے چھچھوراپن ہے۔ کاش مصنفہ اس جانب بھی توجہ مرکوز کرتیں تو تمام پہلو سامنے آجاتے۔

بہرحال یہ کتاب ایک ایسی دستاویز ہے جس میں ازمنۂ قدیمہ اور دورِ وسطیٰ سے لے کر عہد جدید تک عورتیں جن حالات سے نبرد آزما رہی ہیں ان کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ لیکن عہدرسالت کی خوبیوں، ان کی معاشرتی اصلاح اور ان کے جائز حقوق کی بازیابی کا ذکر نہ آنا اور اس دور کے محامد ومحاسن کو نظرانداز کر دینا ایک مسلم قلم کار کو زیب نہیں دیتا۔ کتاب میں صفحہ 72 سے 82 تک درج سوالات اور ان کے آپشنل جوابات معلوماتی ضرور ہیں لیکن میرے نزدیک انہیں اس کتاب میں شامل کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

کتاب صوری ومعنوی اعتبار سے بہتر ہے اور حوالہ جات سے مزین بھی، لیکن کمپوزنگ کی غلطیاں بکثرت ہیں، ان پر خاص توجہ کی ضرورت تھی۔

☆ مبصر کا پتہ: J-3/78 کچی باغ، وارانسی-221001 (یوپی)
Mobile: 9839878316

□□□

اردو شاعری میں قومی یکجہتی

مصنف: ڈاکٹر شہلا بانو

تبصرہ: ڈاکٹر ارشاد احمد☆

پیش نظر کتاب 'اردو شاعری میں قومی یکجہتی' ڈاکٹر شہلا بانو کی محققانہ کاوش ہے۔ مصنفہ درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کو بالترتیب تین ابواب قومی یکجہتی: تعارف، اہمیت و ضرورت، اردو ادب میں قومی یکجہتی: ایک اجمالی جائزہ اور اردو شاعری میں قومی یکجہتی: ایک خصوصی جائزہ میں تقسیم کیا ہے۔

زیر مطالعہ کتاب کا پہلا باب خاصا اہم اور توجہ طلب ہے۔ اس باب کے تحت مصنفہ نے قومیت کا تعارف کراتے ہوئے ان عناصر کی نشاندہی کی ہے جن کے تحت مختلف ادوار میں قومیں سماجی، سیاسی اور مذہبی طور پر متحد رہتی آئی ہیں۔ انہوں نے مغربی اور مشرقی دانشوروں کے اقوال سے قومیت اور اور اس کی ضرورت کے تصور کو واضح کیا ہے۔ وہ مہاتما گاندھی کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''مذہب قومیت کی کسوٹی نہیں ہے۔ یہ خدا اور آدمی کے درمیان ایک ذاتی مسئلہ ہے۔ قومیت کے اعتبار سے ہم اوّل و آخر ہندوستانی ہیں چاہے ہمارا مذہب کچھ بھی ہو''۔ (ص:13)

ڈاکٹر شہلا بانو نے اپنی کتاب میں ان بادشاہوں کے کارناموں کا بالتفصیل تذکرہ کیا ہے جنہوں نے قومی یکجہتی، امن و شانتی اور ہندو مسلم اخوت پر مبنی معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے لیے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ اس ضمن میں چندر گپت موریہ، اشوک اعظم، کنشک، سمدر گپت، راجہ ہرش وردھن اور راجہ بھوج وغیرہ کے دور میں مذہبی رواداری اور معاشرتی امن و سکون پر جو حکمت عملی اختیار کی گئی ان پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔

صفحات: 200 قیمت:-/200 اشاعت:2024

ISBN 978-93-90579-86-0

ناشر: ایپلائڈ بکس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-110002

Mobile: 9953630788

مسلم حکمران اور صوفیائے کرام نے بھی قومی یکجہتی کے فروغ لیے لائق تحسین کارنامے انجام دیے ہیں۔ مصنفہ نے اس کی تفصیل بڑی دیانت داری سے لکھی ہے اور اس کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ مسلمانوں کی ہندوستان آمد کے بعد متعدد مسلم اسکالرس نے سنسکرت کی باضابطہ تعلیم حاصل کی اور شہرۂ آفاق تصنیفات سے ہندوستانی عوام کو کافی فائدہ پہنچایا۔ کئی مسلمانوں نے سنسکرت کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ یہ تمام کارنامے قومی یکجہتی کی کڑیوں کو مضبوط کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شہلا بانو نے اپنی کتاب کے دوسرے باب 'اردو ادب میں قومی یکجہتی: ایک اجمالی جائزہ' میں یہ بتایا ہے کہ اردو زبان کی پیدائش ہی قومی یکجہتی کی بہترین مثال ہے۔ عدالت عظمیٰ (Supreme Court) نے بھی اردو کو گنگا جمنی تہذیب کا بہترین نمونہ تسلیم کیا ہے۔ اس زبان میں مختلف زبانوں کی آمیزش ہے اور اس کے بولنے والے مختلف مذہب، نسل اور علاقوں میں بسنے والے افراد ہیں۔ اس زبان کا فروغ، ترقی و ترویج بھی قومی یکجہتی کی مرہون منت ہے۔ اردو کی ترقی کے سلسلے میں بازار، فوجی چھاؤنی، بادشاہوں کے دربار اور صوفیائے کرام کی خانقاہوں کا کلیدی رول رہا ہے۔ قدیم زمانے میں ان سارے مقامات پر ہندوستانی عوام کی رسائی بلا تفریق مذہب و ملت اور رنگ و نسل ممکن تھی جس کا عکس آج بھی ہمیں نظر آتا ہے۔ مصنفہ نے اس باب میں مختلف رسوم کا بھی تذکرہ کیا ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے یہاں یکساں طور پر رائج رہے ہیں۔ بچوں کی پیدائش، شادی، منگنی، بارات اور وفات کے موقع پر منعقد کی جانے والی تقریبات میں بھی کافی یکسانیت ہے۔ ڈاکٹر شہلا بانو نے اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مسلم حکمرانوں نے بھی ایسی رسموں کی ترویج میں اہم رول ادا کیا ہے جن میں اکبر اعظم کا نام سر فہرست ہے۔

ڈاکٹر شہلا بانو اپنی کتاب کے تیسرے باب میں شاعری کے حوالے سے قومی یکجہتی کے فروغ کو بحث کا موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے صنف شاعری کی چند مقبول اصناف میں قومی یکجہتی پر مبنی اشعار پر بھی گفتگو کی ہے۔ اس ضمن میں مصنفہ نے سب سے پہلے صنف مثنوی کا تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے مثنوی کی ساخت

اور موضوعات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ مثنویوں میں زیادہ تر پندونصائح اور متصوفانہ خیالات کا اظہار رہا ہے، جن سے قومی یکجہتی کے فروغ کی مٹی ہموار ہوتی ہے۔طویل مثنویوں میں ہندوستانی کلچر، رسوم اور طرزِ زندگی کی بہترین ترجمانی ملتی ہے۔ ان میں جن موضوعات کا چرچا ہے وہ خالص ہندوستانی عناصر ہیں اور ظاہر سی بات ہے کہ ان عناصر کے باہمی اختلاط سے قومی یکجہتی کا باب مکمل ہوتا ہے۔وہ لکھتی ہیں:

''بکٹ کہانی یا بارہ ماسہ خالص ہندوستانی چیز ہے۔ یہ رت وَرنن (موسم کا بیان) نہیں ہے کہ کیونکہ رُت وَرنن میں چاروں رُتوں کا بیان ہوتا ہے۔ بارہ ماسہ میں بارہ مہینوں کا بیان ہے۔بکٹ کہانی میں افضل نے ایک عورت، جس کا شوہر پردیس میں ہے، اس کی زبان سے اس کی برہ (جدائی) کی کہانی سنائی ہے۔وہ اس کے آنے کا دن گن رہی ہے''۔ (ص:92-91)

اسی طرح ڈاکٹر شہلا بانو نے نظم، غزل، مرثیہ، نعت اور گیت میں بھی قومی یکجہتی کے پہلوؤں کی تلاش وجستجو میں درجنوں صفحات سیاہ کیے ہیں۔نظم میں قلی قطب شاہ، نظیرا کبر آبادی، سرور جہان آبادی، سیماب اکبر آبادی، حفیظ جالندھری، علامہ اقبال، تلوک چند محروم، ساغر نظامی، فراق گورکھپوری، شفیق جونپوری، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، گوپی ناتھ امن اور جاں نثار اختر کی نظم نگاری میں قومی یکجہتی کے عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔مصنفہ کے خیال میں نظیر اکبر آبادی خالص قومی یکجہتی کے شاعر ہیں۔

ڈاکٹر شہلا بانو نے لکھا ہے کہ ''غزل کے موجد امیر خسرو کہے جا سکتے ہیں''۔(ص:136) لیکن اردوداں طبقہ رودکی سمر قندی پر اتفاق رکھتا ہے۔انہوں نے غزل گوشعرا کی نگارشات میں قومی یکجہتی کے عناصر کی تلاش نہایت باریک بینی سے کی ہے۔ قدیم شاعروں میں امیر خسرو، ملا وجہی، ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، فائز دہلوی، حاتم، آبرو، میر تقی میر، درد، انشا، رنگین اور بہادر شاہ ظفر کی تخلیقات میں قومی یکجہتی، انسان دوستی اور اخوت کو فروغ دینے والے اشعار پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔اسی طرح جدید غزل گوشعرا میں اسمٰعیل میرٹھی، محمد علی جوہر، مضطر خیر آبادی، صفی لکھنوی، جگر مرادآبادی، اثر لکھنوی، جوش ملیح آبادی، نازش پرتاب گڑھی اور سلام مچھلی شہری جیسے شعرا کے کلام میں اتحاد واتفاق، وطن دوستی، بین المذاہب امن وسلامتی کے فروغ دینے والے عناصر اجاگر کیے گئے ہیں۔

نہ تو ہندو کبھی دیکھا نہ مسلماں دیکھا
میں نے انساں کی نظر سے سوئے انساں دیکھا

ڈاکٹر شہلا بانو نے مرثیہ، نعت اور گیتوں میں بھی قومی یکجہتی کے فروغ کا پہلو ڈھونڈ نکالا ہے۔انہوں نے بتایا ہے کہ صنف نعت میں مسلم شعرا کے علاوہ صدہا غیر مسلم شعرا نے بھی بہترین نعتیں تخلیق کی ہیں۔ان میں لکشمی نرائن شفیق، مکھن لال، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، دلورام کوثری، عرش ملسیانی، کنور مہندر ناتھ بیدی سحر، چمن لال چمن، تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، پنڈت تربھون لال زتشی، عاشق لکھنوی اور راجندر بہادر موج کے اسماء گرامی اہمیت کے حامل ہیں۔

'اردو شاعری میں قومی یکجہتی' دوسرے مبصر کا تجزیہ

مبصر: ڈاکٹر وقار انور، نئی دہلی۔موبائل:8802281236

مثنویوں کے سلسلہ میں کتاب کی فراہم کردہ اس بات کو نوٹ کیا جا سکتا ہے کہ اردو میں نظموں سے زیادہ مثنویاں لکھی گئی ہیں۔شروع کے ادوار میں پہیلیوں، نصائح، اور متصوفانہ خیالات کے اظہار میں مثنوی کی صنف کا ہی استعمال ہوا۔ امیر خسرو کی پہیلیاں اور مکرنیاں اس کی مثالیں ہیں۔ بعد میں طویل مثنویاں لکھی گئیں جن میں ہندی زبان اور مقامی استعارات کے ذریعہ عشق کی داستانیں رقم کی گئیں جن میں مذہب کی دیواروں سے نکل کر محض عشق کے جذبہ سے سرشار واقعات لکھے گئے اور مقبول ہوئے۔

نظموں کے سلسلہ میں کتاب میں عادل شاہ اور محمد قلی قطب شاہ اور ان کی سرپرستی میں ملی جلی تہذیب کی نمائندگی کرنے والی نظموں کا ذکر کر کے ان کا تعارف کرایا گیا ہے۔کتاب میں نظیر اکبر آبادی، سرور جہان آبادی، سیماب اکبر آبادی، تلوک چند محروم، ساغر نظامی، مخدوم محی الدین، شفیق جون پوری، فراق گورکھپوری اور دیگر شعرا کے کلام کے نمونوں کے ساتھ اقبال کی شاعری کے دور اول کی نظموں کی مثالوں سے حب الوطنی اور ہندوستانی مزاج کی نمائندہ مثالیں جمع کی گئی ہیں اور ان پر تبصرہ کیا گیا ہے۔اسی انداز سے کلام کے نمونوں اور ان کی وضاحت

کے ساتھ غزل، مرثیہ، نعت اور گیت کی اصناف میں ان پہلوؤں کی تلاش وجستجو کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک پہلو جو مرثیہ اور نعت کے سلسلہ میں ابھارا گیا ہے وہ ان دونوں اصناف میں غیر مسلم شعرا کی کاوشیں ہیں۔

گیت کی صنف کے حوالہ سے تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ زیادہ تر مثالیں ان شاعروں کی ہیں جو بنیادی طور پر ہندی زبان سے جڑے ہوئے لوگ ہیں جیسے کہ سورداس اور میرابائی۔ گرچہ سلام مچھلی شہری، قیوم نظر اور دیگر اردو کے شعرا کے کلام کے نمونے بھی ہیں لیکن ایک کمی جو کھٹکتی ہے وہ بکل اتساہی کی غیر موجودگی ہے۔ غزل اور گیت کی روایت میں ایک بنیادی فرق ہے۔ استثنائی صورتوں کے علاوہ غزل میں حب اور محبوب دونوں عام طور پر مذکر ہوتے ہیں جب کہ گیت میں زیادہ تر صنف نازک کے احساسات خصوصاً فراق کی کیفیات کی نمائندگی ہوتی ہے۔ اگر اس کتاب کے دوسری ایڈیشن کا موقع آجائے تو مصنفہ صنف نازک کے احساسات کو بیان کرنے والی اس صنف کا بھرپور حق بھی ادا کرسکتی ہیں۔

ادارتی نوٹ: ایک ہی کتاب پر دو تبصرے ملنے کی صورت میں دونوں مبصرین کی آرا کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

□□□

اک نئی بات نکل آئی ہے

مصنف: ڈاکٹر محمد اظہر حیات

مرتّب: ڈاکٹر ریشما تزئین

تبصرہ: ریاض احمد قادری☆

ناگپور کے ایک صاحب علم فرد اور انتہائی فعال ادبی شخصیت ڈاکٹر محمد اظہر حیات (ایم اے، پی ایچ. ڈی) کی یہ کتاب چند ادبی اور سوانحی مضامین کا مجموعہ ہے جسے ان کی عزیز

صفحات: 280 قیمت:-/300 اشاعت:2024
ISBN 978-93-91721-88-6
ناشر: الفاظ پبلی کیشنز، چھٹا ناولی، کامٹی-441001 ناگپور۔
Mobile: 9823704714 (مہاراشٹر)

شاگردہ محترمہ ڈاکٹر ریشما تزئین نے اپنے ذوقِ لطیف کے مطابق مرتب کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔

ڈاکٹر محمد اظہر حیات کی ادبی زندگی کا آغاز کہانی نویس کے طور پر ہوا۔ ناقدین ادب کے نزدیک کہانی لکھنا بھی ایک فن ہے جس میں انشاپردازی، قوت خیال اور وسیع مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے اور لکھتے وقت واقعات و کردار کو پُرلطف انداز میں بیان کرنا ہوتا ہے۔ درحقیقت کہانی مصنف کی طبع زاد چیز ہوتی ہے۔ 20 سال کی عمر میں ڈاکٹر اظہر حیات نے پہلی کہانی 'پیار کا بھوکا' لکھی جو ماہنامہ نور رامپور میں 1974 میں شائع ہوئی۔ لکھنے کی مشق کے ساتھ انہوں نے اپنا تعلیمی سفر بھی جاری رکھا۔ 1975 میں گریجویشن اور 1978 میں پوسٹ گریجویشن کی ڈگری حاصل کرلی۔ 6 سال تک مملکت سعودی عرب کے شہر ظہران کی ایک آئل کمپنی سے بحیثیت کمپیوٹر آپریٹر وابستہ رہے۔ وطن واپس آئے تو دوبارہ تعلیمی سلسلہ شروع ہوا۔ 1988 میں بھوپال یونیورسٹی سے بی ایڈ کا کورس مکمل کیا اور 1997 میں اپنا تحقیقی مقالہ (تھیسس) 'مولوی نذیر احمد کے ناولوں میں تعلیمی تصورات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ' کے عنوان سے مکمل کرکے ناگپور یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی (پی ایچ. ڈی) کی سند حاصل کی۔

ڈاکٹر محمد اظہر حیات کی شناخت علمی حلقوں میں اس وقت ہوئی جب عربی ادب کے باکمال ادیب، مقبول ڈرامہ نگار، نامور شاعر بلکہ امیر الشعرا احمد شوقی سے متعلق ان کی کتاب 'احمد شوقی: ایک مطالعہ' (حیات بک ڈپو کے ذریعہ) 1991 میں زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئی اور جب 2000ء میں جذب وکیف میں ڈوبا ہوا ان کا سفرنامۂ حجاز 'لبیک' نامی کتاب کی شکل میں ادبی حلقوں میں پہنچا تو ایک اچھے انشاپرداز کی حیثیت سے وہ متعارف ہوئے۔ مولوی نذیر احمد کے ناولوں کو انہوں نے جب اپنی تحقیق کا موضوع بنایا تو ایک محقق کے طور پر مشہور ہوگئے۔ تصنیف و تالیف کے ساتھ صحافت سے بھی ان کا یک گونہ تعلق رہا۔ متعدد اخبارات میں مدیر کی حیثیت سے کام کیا اور ان میں لکھے گئے ان کے کالم بہت مقبول ہوئے۔

زیر تبصرہ کتاب ڈاکٹر محمد اظہر حیات کے ان مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جنہیں موصوف نے متعدد معروف یا غیر مشہور شعرا

کے بارے میں وقتاً فوقتاً تحریر کیا تھا۔ یہ مضامین مختلف رسائل وجرائد میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ ناگپور سے تعلق رکھنے والے انیسویں صدی کے صاحب دیوان شاعر سید عبدالعلی عادلؔ کے ذکر سے اس کتاب کا آغاز ہوا ہے اور نظیر احمد نظیر ناگپوری کے تذکرے پر اس مجموعہ کا اختتام ہے۔ درمیان میں فانی بدایونی، جگر مرادآبادی، حسرت موہانی، کیفی اعظمی، احمد فراز، پروین شاکر، ندا فاضلی، مظفر حنفی، جگن ناتھ آزاد، ظفر گورکھپوری، ڈاکٹر منشاء الرحمٰن منشا اور مولانا ناطق گلاؤٹھوی جیسے صاحبان فکر وفن کا نام ہے جن کی شاعری پر ڈاکٹر محمد اظہر حیات نے اپنے تاثرات کو ثبتِ قرطاس کیا ہے اور شاطر حکیمی، طرفہ قریشی، حمید ناگپوری، پاگل انصاری، شاہد کبیر، سید یونس، خضر ناگپوری اور کیفی اسماعیلی وغیرہ جیسے کم مشہور یا غیر معروف شعرا کو بھی اپنے مضمون کا عنوان بنایا ہے۔ کتاب کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعے میں شعر وادب کے وہ تمام رنگ روپ موجود ہیں جن سے مضمون نگار کی ادبی شخصیت پہچانی جاسکتی ہے۔ دوران مطالعہ مجھے احساس ہوا کہ ان مضامین کا لکھنے والا سخن فہم بھی ہے اور سخن دان بھی، نقاد بھی ہے اور خاکہ نگار وانشا پرداز بھی۔ ڈاکٹر محمد اظہر حیات اپنے مضمون میں سیّد فضل الحسن حسرت موہانی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''حسرت نے غزل کی دم توڑتی ہوئی روایات کو ازسرنو تازگی اور شگفتگی و شائستگی بخشی۔ غزل کے محدود کینوس کو وسیع کیا اور اسے زندگی سے قریب تر کر کے ایک بار پھر غزل کو قبولیت عام کی خلعت سے سرفراز کیا۔ جب مِسّی اور کاجل کے تہ بہ تہ بوجھ سے اردو شاعری گراں بار تھی، تب حسرت کی حیات بخش، جذباتی، نرمی و معصومیت سے بھرپور ایک وجدانی محویت اور احساس طہارت سے گھلی ملی آواز میدان ادب میں گونجی جس نے جلد ہی دنیائے ادب میں اپنا ایک مقام پیدا کرلیا اور اسے نئی روایات اور نئے راستے دکھائے۔'' (صفحہ:54)

اقتباس بالا اس بات کا شاہد ہے کہ اس عبارت کو لکھنے والا غزل کے مزاج اور اس کے عروج وزوال کے ادوار سے بخوبی واقف ہے اور اپنی بات کو سلیقے سے بیان کرنے کا ہنر بھی رکھتا ہے۔ حسرت کی شاعری سے متعلق ان کی یہ رائے بھی بڑی جچی تلی ہے:

''ان کی زبان شستہ، رواں دواں اور طرز بیان شگفتہ ہے۔ ان کی ترکیبیں، ان کے بولتے فقرے اور ان کا پُرشوق لیکن حیا آمیز و حیا آموز انداز بیان حسرت کے کلام کو چار چاند لگا دیتا ہے۔'' (صفحہ:56)

کیفی اعظمی کے بارے میں ادیبوں اور نقادوں نے بہت کچھ لکھا اور معتقدین نے انہیں سر پر بٹھایا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر محمد اظہر حیات نے بھی اپنے قلم کو جنبش دی اور یہ فقرے ثبت قرطاس ہوئے:

''کیفی کی شاعری کو پڑھ کر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری اعتماد اور حوصلہ مندی کی شاعری ہے۔ نفرت کی آگ بجھانے اور زخمی دلوں پر بھائی چارہ کا مرہم لگانے کی شاعری ہے۔ ان کی شاعری ظلم وستم، جبر وتشدد کے خلاف اعلان جنگ کی شاعری ہے۔ کیفی شاعر انسانیت تھے۔'' (صفحہ:84)

پاکستانی شاعر احمد فراز کی شاعری اردو میں ایک جدید اور زور آور آواز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے سوچنے کے انداز میں خلوص اور فکر میں حساسیت ہے۔ وہ اپنے وطن کے مظلوموں کے شاعر ہیں اس لیے جب امیرانِ شہر اہل وطن کو کبھی مذہب اور کبھی وطن کے نام پر لوٹتے ہیں تو وہ پکار اٹھتے ہیں:

امیر شہر غریبوں کو لوٹ لیتا ہے
کبھی بہ حیلۂ مذہب کبھی بنام وطن

ڈاکٹر محمد اظہر حیات نے بھی فراز کی شاعری کا مطالعہ کیا اور اپنے جذبات کو ان سادہ الفاظ میں ظاہر کیا ہے:

''فراز کے اشعار دل سے نکلتے ہیں اور سیدھے سننے والوں کے دل میں اتر جاتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں بلا کی روانی اور بے ساختگی ہے۔ وہ بلاشبہ ایک فطری شاعر تھے۔''

ندا فاضلی کے بارے میں موصوف کے یہ جملے قابل توجہ ہیں:

''ہمیں ان کے یہاں کتابی الفاظ اور موضوعات سے زیادہ ذاتی تجربہ اور آپ بیتی نظر آتی ہے۔ ندا کی نظموں، غزلوں یہاں تک کہ نثر میں بھی وہ صرف اپنے تجربہ کی روشنی میں زندگی کو دیکھتے ہیں۔ گویا ندا آنکھ اور دل کے شاعر ہیں۔ جو کچھ دیکھتے ہیں اسے محسوس بھی کرتے ہیں اور جو محسوس کرتے ہیں اسے رقم

کرتے ہیں۔''

کتاب میں سب سے طویل مضمون جگن ناتھ آزاد سے متعلق ہے۔ آزاد صاحب اردو کی آغوش میں پلے بڑھے تھے۔ ان کے والد تلوک چند محروم اردو زبان کے ایک نامور شاعر تھے۔ آزاد کی ابتدائی تعلیم انہی کی تربیت میں ہوئی۔ وہ اردو زبان کے ساتھ مسلم تہذیب کے بھی ہمیشہ دلدادہ رہے کہ مسلمانوں کے بیچ رہ کر پلے بڑھے اور جوان ہوئے تھے۔ اسلام سے متعلق ان کا مطالعہ اچھا خاصا تھا۔ ڈاکٹر اقبال کے اشعار سے انہیں عشق تھا اور اقبالیات ان کا پسندیدہ موضوع۔ اقبال کے اشعار سے دلچسپی کا نتیجہ یوں ظاہر ہوا کہ حضرت خاتم المرسلین ﷺ سے بھی انہیں محبت وعقیدت ہوگئی اور اس کا اظہار انہوں نے اپنے نعتیہ اشعار میں کیا:

سلام اس ذات اقدس پر، سلام اس فخر دوراں پر
ہزاروں جس کے احسانات ہیں دنیائے انساں پر
سلام اس پر کہ جس کے نور سے پُرنور ہے دنیا
سلام اس پر کہ جس کے نطق سے مسحور ہے دنیا

تقسیم ہند کے پُرآشوب دور میں ہندو مسلم آپس میں متحد نہ رہ سکے۔ دونوں جانب نفرت وتعصب اور عداوت کی جو آگ بھڑکائی گئی اس کا نتیجہ خوں ریزی اور قتل عام کی صورت میں سامنے آیا۔ جان و مال اور عزت و ناموس کی حفاظت محال تھی۔ ایک دل فگار شاعر جگن ناتھ آزاد جس نے ان خوں چکاں واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اپنے اشعار کے ذریعہ آتش انگیز منافرت کو محبت و اخوت میں تبدیل کرنے کی کوشش کی، لیکن حالات سے مایوس ہو کر کہہ اٹھے:

جہاں چاروں طرف سے آندھیاں مذہب کی چلتی ہوں
وہاں ہم عقل کی مشعل جلائیں بھی تو کیا ہوگا؟

جگن ناتھ آزاد اپنے سینے میں ایک حساس دل رکھتے تھے۔ مسلمانوں کی حالت زار پر انہیں ترس آتا ہے، وہ انہیں عزم و ہمت اور حوصلہ و جرأت کا سبق یاد دلاتے ہوئے اپنی نظم 'بھارت کے مسلمان' میں کہتے ہیں:

اس دور میں تو کیوں ہے پریشان و ہراساں؟
کیا بات ہے؟ کیوں ہے متزلزل ترا ایماں؟
دانش کدۂ دہر کی اے شمع فروزاں!
اے مطلع تہذیب کے خورشید درخشاں!
حیرت ہے گھٹاؤں سے ترا نور ہے ترساں
بھارت کے مسلماں!!!

ڈاکٹر محمد اظہر حیات کے اس مجموعۂ مضامین میں ان کے شفیق اساتذہ پروفیسر سیّد رفیع الدین اشفاق اور ڈاکٹر منشاء الرحمٰن منشا سے متعلق بھی مضامین شامل ہیں جو اہم معلومات کے ساتھ مصنف کی وسعت قلبی، اعلیٰ ظرفی اور اپنے قدیم اساتذہ کی قدردانی کی عمدہ مثال ہیں۔ دونوں مضامین دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں۔

الحاصل موصوف کی اس کتاب کے مطالعہ سے دنیائے ادب کے نامور ادبا و شعرا کے ساتھ چند غیر معروف شعرا کے بارے میں بھی واقفیت ہوتی ہے۔ ناسپاسی ہوگی اگر اس کتاب کو حسن ترتیب سے مزین کرنے والی شخصیت ڈاکٹر ریشما تزئین صاحبہ کو داد وتحسین سے نوازنے میں کوتاہی کی جائے، جنہوں نے اپنے استاذ کی اہم تحریروں کو یکجا کر کے 'اک نئی بات نکل آئی ہے' کے عنوان سے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔

حسین سرورق اور نفیس طباعت کے باوجود کمپوزنگ کی خامیاں کچھ زیادہ ہیں۔ متعدد جگہ اشعار میں الفاظ کی بیشی یا کمی نے مصرعوں کو بحر سے خارج کر دیا ہے، مثلاً صفحہ 32 پر چوتھے شعر کے دوسرے مصرع میں 'ہے' کے اضافہ سے مزہ کرکرا ہوگیا۔ صفحہ 34 کے تیسرے شعر کے پہلے مصرع میں کاما اور دوسرے مصرع میں 'ہر' کی ٹھونس ذوق لطیف پر گراں گزرتی ہے۔ یہی حال صفحہ 39 کے پہلے شعر میں دوسرے مصرع کا ہے۔ جگر کا مولد بنارس قرار دینا (صفحہ 45) محل نظر ہے۔ صفحہ 51 پر جگر مرادآبادی کا جو شعر درج ہے اس کے مصرع اول میں عشق کے بعد لفظ 'مست' چھوٹ گیا ہے، کلیات جگر میں یہ شعر اس طرح ہے:

شیشہ مست و بادہ مست و حسن مست و عشق مست
آج پینے کا مزہ پی کر بہک جانے میں ہے

جگن ناتھ آزاد کے متعدد اشعار میں بھی کمپوزنگ کی ایسی غلطیاں موجود ہیں جن سے اشعار کا حسن غارت ہوجاتا ہے، نثر کا

حال بھی بہت بہتر نہیں ہے۔ کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی طباعت کا مرحلہ پیش آئے تو پروف کی اصلاح بہت ضروری ہے۔ کتاب کا نام بھی مضامین کی سرخیوں سے میل نہیں کھاتا، کوئی مختصر اور خوبصورت نام رکھا جاتا تو بہتر ہوتا۔

☆ مبصر کا پتہ: J-3/78 کچی باغ، وارانسی-221001 (یوپی)
Mobile: 9839878316

❑❑❑

جدید اردو نعت: سمت و رفتار

مصنف: ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی

تبصرہ: سعید اختر اعظمی☆

نعت گوئی معجزۂ ہنر کی دشوار گزار رہ گزر ہے جس پر چلنے والوں کو بجا طور پر 'مردان صفا' قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی کہکشاں کے راہ رو ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی ہیں جنہوں نے 'اردو شاعری میں نعت گوئی' پر رانچی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ یہ ان کا محبوب موضوع رہا ہے جس پر انہوں نے کئی مضامین لکھے جو مختلف رسائل و جرائد کی زینت بنے۔ اس سے ان کے عمیق مطالعہ کا بھی علم ہوتا ہے جس کی بدولت حلقۂ اہل ادب میں ان کی منفرد شناخت قائم ہوئی۔

'جدید اردو نعت: سمت و رفتار' چیدہ چیدہ بکھرے نصف درجن سے زائد مضامین کا مجموعہ ہے جنہیں حسن ترتیب عطا کر کے قارئین کے روبہ رو کیا گیا ہے۔ 'اردو میں نعت گوئی کا ارتقا' میں بتلایا گیا ہے کہ قدیم دکنی شعرا نے اس کا تواتر سے اہتمام کیا جن کے ثبوت کے طور پر ان کے نعتیہ دیوان اور نعتیہ غزلیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس کی چہار صد سالہ تاریخ اس کے مومنہ اور کلمہ گو ہونے کا خوب صورت اعترافیہ ہے۔ خوب محمد چشتی، محمد قلی قطب شاہ، ابن نشاطی، نصرتی، قاضی محمود بحری، سید محمد فراقی، مرزا محمد رفیع سودا، میر تقی میر، اسمعیل شہید دہلوی، کرامت علی شہیدی، مومن خاں مومن، لطف بریلوی، امیر مینائی، محسن کاکوروی، الطاف حسین حالی، ظفر علی خان، اقبال، احمد رضا خاں، سیماب اکبر آبادی، بہزاد لکھنوی، عامر عثمانی، نشور واحدی، بیکل اتساہی، زیب غوری، حفیظ تائب، تابش مہدی وغیرہ تک ایک طویل سلسلہ ہے۔ اس کے علاوہ قصائد، گیت، پابند و آزاد اور نثری نظم کی ہیئت میں عہد جدید کے شعرا نے نعت گوئی کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ 'نعتیہ شاعری کے آداب اور اسالیب' یہ ہیں کہ معشوقیت کے روایتی تصور سے گریز کیا جائے، فراوانی جذبات اور وفور شوق میں کہیں سے کہیں نہ جایا جائے، مبالغہ، غلو اور اغراق کے عناصر سے احتراز برتا جائے، عشق رسول کو اتباع رسول (ﷺ) سے مشروط رکھا جائے، اسوۂ حسنہ اور سیرت طیبہ پر ارتکاز کیا جائے۔ 'جدید اردو نعت میں روح عصر' پیش کرنے والوں میں حالی نمایاں ہیں جنہوں نے 'مسدس حالی' میں عہد زوال و انحطاط کی تصویر کشی کے شانہ بہ شانہ ملّی شعور کی آئینہ داری بھی کی ہے۔ جوش، کلیم عاجز اور شاذ تمکنت کے یہاں بھی ملت اسلامیہ کا درد موجود ہے۔

'اردو نعت میں غیر مسلم شعرا کا حصہ' مسلم شعرا سے کہیں زیادہ ہے جنہوں نے اس سرمائے کی توسیع کا اعزاز حاصل کیا۔ اس موضوع پر نصف درجن سے زائد تحقیقی کتب موجود ہیں۔ لکشمن نرائن شفیق، مکھن لال مکھن، مہاراجا شری کرشن پرشاد شاد، چودھری دلّو رام کوثری، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، پنڈت ہری چند اختر، پنڈت بال مکند عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، کرشن کمار طور، چندربھان خیال، برج نرائن چکبست وغیرہ اس حوالے کو معتبر کرتے ہیں۔ 'اردو نعت میں خواتین کا حصہ' صحابیات اور امہات المومنین سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت حفصہ بنت عمر، حضرت میمونہ، حضرت فاطمہ الزہرا، حضرت خنساء، حضرت خولہ اور حضرت اُمّ ایمن وغیرہ سے آگے بڑھیں تو مہ لقا بائی چندا، لطف النساء امتیاز، شرف النسا شرف، نوشابہ خاتون، تہنیت النساء تہنیت، زینت بی بی محجوب، بی بی روشن پھلواروی، بی بی منیر النساء، جمیلہ رضیہ خاتون، بی بی محمودہ خاتون، خیر النساء بہتر، عائشہ نسیم، سیدہ سردار بیگم اختر، رخسانہ

صفحات: 160 قیمت: -/200 اشاعت: 2023
ناشر: عذرا بک ٹریڈرس، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی-2
Mobile: 9449127861

نکہت لاری ام ہانی، صائمہ خیری، مخفی بدایونی، انجنا سدھیر، رام پیاری، تیجندرادا وغیرہ کے اسمائے گرامی تاریخ نعت گوئی کے صفحات پر روشن حروف سے نقش ہیں۔ 'کرناٹک میں اردو کی نعتیہ شاعری' کا جائزہ لیا جائے تو اس حوالے سے حافظ کرناٹکی، ڈاکٹر سید شاہ مدار عقیل، ڈاکٹر راہی فدائی، اسد اعجاز، ریاض احمد خمار مرحوم، منیر احمد جامی، اکمل آلدوری، عزیز بلگامی، عبدالقدیر شاکر بنگلوری، سلام نجمی، کوثر جعفری بھٹکلی، نور احمد سورج کرناٹکی، عبدالستار مائل ٹمکوری، رزاق کوثر، رزاق اثر، آغا اختر عباس اختر علوی، زین العابدین تقدیر مرحوم، عبدالحق جوہر صدیقی، محمد حبیب صابر شاہ آبادی، ڈاکٹر سید شاہ خسرو حسینی، ڈاکٹر وحید انجم، سید صبیح حیدر صبیح مرحوم، عبدالستار خاطر، راج پریمی، ڈاکٹر صغری عالم مرحومہ، سیدہ اختر مرحومہ، زہرا بتول، حسنی سرور، رضیہ یاسمین راز، شہوار بیگم، فریدہ رحمت اللہ وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔

'دکن میں اردو کی نعتیہ شاعری' آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے جب مثنویوں میں نعتیہ آہنگ کی کارفرمائی تھی۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، نوازش علی شیدا، اعظم علی شائق، امجد حیدرآبادی، شاذ تمکنت، مسعود جاوید ہاشمی، ریاض تنہا، رؤف خیر، شاہ حسین نہری، رفیعہ منظور الامین، بشر نواز، سلیمان اریب، عزیز قیسی، مختار بدری وغیرہ کے دم قدم سے اس صنف کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ 'شعرائے بھٹکل کی نعتیہ شاعری' مادری زبان نوائطی ہونے کے باوجود پروان چڑھی۔ فن نعت گوئی میں یہاں کے شعرا نے ندرت وسلاست کے ساتھ فکری طہارت کا بھی پاس ولحاظ رکھا۔ محمد حسین فطرت مرحوم، عبدالرحیم ارشاد، کوثر جعفری، حسرت بھٹکلی، سید اشرف برماور مرحوم، سید عبدالرحمن باطن مرحوم، ظفر علی معلم مرحوم، پیام سعیدی، عبدالعلیم شاہین، ڈاکٹر محمد حنیف شباب، مصطفیٰ تابش وغیرہ کے یہاں جذبے کی سچائی، خلوص اور اثر آفرینی پائی جاتی ہے۔ 'شعرائے بہار کی نعتیہ شاعری' صوفیائے کرام کی مرہون منت رہی ہے۔ یہ شاہ وحید الحق ابدالی قادری سے شروع ہوتی ہے اور اس قافلہ شوق میں حسرت عظیم آبادی، راسخ عظیم آبادی، سید شاہ عطا حسین فانی گیاوی، شاہ فرزند علی صوفی منیری، شاہ محمد اکبر داناپوری، شاد عظیم آبادی، سید سلیمان ندوی، تمنا عمادی، جمیل مظہری، رخشاں ابدالی، نادم بلخی وغیرہ شامل ہوتے چلے گئے۔

آخری صفحات میں صاحب کتاب سے ڈاکٹر محمد حنیف شباب کا مکالمہ ہے جو موضوع ہذا کی تفہیم میں معاون بنتا ہے۔ اگرچہ بعض مضامین میں موضوع کی وسعت کے باوجود قدرے اختصار سے کام لیا گیا ہے تاہم متذکرہ عناوین کا اجمالی خاکہ ضرور سامنے آجاتا ہے۔ ان موضوعات کا مطالعہ کرتے ہوئے کہیں کہیں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ عہد حاضر کے محققین کے لیے اشارہ ہے کہ وہ اس خلا کو پُر کریں اور موضوع کا کما حقہ حق ادا کرنے کی سعی کریں۔

☆ مبصر سے رابطہ: ریاض (سعودی عرب)
Mobile: +966598300320

□□□

کلاسیکی شاعری کی ہیئتی اصناف

مصنفہ: ڈاکٹر سلمیٰ رفیق

تبصرہ: ابراہیم افسر☆

جب ہم کلاسیکی ادب پر گفتگو کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہمارے ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ کسی فن پارے کو ہیئت کے اعتبار سے کلاسیکی ادب کے زمرے میں شامل کیا جائے؟ یا کسی ادیب اور شاعر کی قدامت کو مدنظر رکھتے ہوئے کلاسیکی ادب تسلیم کیا جائے؟ اس سوال کے نتیجے میں جو جواب ہمیں دستیاب ہوتے ہیں ان کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ کسی بھی فن پارے کو اس کی نوعیت، قدامت، استقامت، مقبولیت، ہیئت، پختگی، جامعیت، آفاقیت اور اعلیٰ اقدار کی رو سے اسے کلاسیکی ادب کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اُردو میں کلاسیکی ادب کا تصور مغربی ادب کے ذریعے داخل ہوا۔ سب سے پہلے یونانی ادب کو ناقدین نے کلاسیکی ادب کے طور پر پرکھا۔ اس

صفحات: 287 قیمت:-/225 اشاعت:2022
ناشر: البلاغ پبلی کیشنز، N-1، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025 موبائل:9971477664

کے بعد رومن اور پھر اس کے بعد مغربی ادب کو کلاسیکی ادب کہا جانے لگا۔ لیکن مغربی ادب کے مدمقابل مشرقی ادب بالخصوص فارسی، عربی اور سنسکرت میں بھی ایسے فن پارے موجود ہیں جنہیں ناقدین نے کلاسیکی ادب کہا ہے۔ مشرقی ادب کی روشنی میں اُردو کے بہت سے قدیم فن پارے اپنی ہیئت اور نوعیت کی وجہ سے کلاسیکی ادب کے زمرے میں شامل کر لیے گئے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'کلاسیکی شاعری کی ہیئتی اصناف' میں ڈاکٹر سلمیٰ رفیق نے کلاسیکی شاعری اور ادب پر تفصیلی تنقیدی گفتگو کی ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں اُردو کی چار شعری اصناف، غزل، رباعی، مثنوی اور قطعہ کو کلاسیکی زمرے میں رکھ کر انہیں پرکھا ہے۔ انہوں نے کلاسیکیت کی اصطلاح، معنی و مفہوم پر واضح روشنی ڈالی ہے۔ ان کی نظر میں اُردو کلاسیکی تخلیقات یورپ کے ادبی سرمایے سے متاثر نظر آتی ہیں۔ ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ اُردو میں کلاسیکی ادب سے متاثر ہو کر کبھی کوئی ادبی فن پارہ نہیں لکھا گیا۔ بلکہ بعد کے لوگوں نے اپنی فہم و شعور سے ان فن پاروں کو کلاسیکی ادب کہا۔ انہوں نے اپنے پیش لفظ میں شاعری پر بحث کرتے ہوئے لکھا کہ شاعری کیا ہے؟ شعر کسے کہتے؟

'غزل' کے باب کو غزل کی روایت اور ابتدائی سرمایہ، غزل کی خارجی ہیئت، غزل کا موضوع، غزل کا فن، غزل کے ارتقا کا سرسری جائزہ اور جدید غزل عنوان کے تحت تقسیم کر اس پر تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مصنفہ لکھتی ہیں کہ غزل فارسی زبان کے لفظ 'غزال' سے نکلا ہے جس کے معنی ہرن کے ہیں۔ حالاں کہ فارسی اور عربی میں غزل کی ہیئت، اس کے اوزان و بحور، تشبیہات و استعارات، تلمیحات و کنایات، مضامین و خیالات وغیرہ پہلے سے ہی موجود تھے جو بعد میں اُردو میں داخل ہوئے۔ وہ مزید لکھتی ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے یہاں قصیدہ عربی شاعری کی شان تھا۔ اور عربی قصیدوں کی تشبیب یا نسیب کا موضوع اکثر عورت ہوتا تھا۔ اس اعتبار سے غزل میں ہمیشہ سے عورتوں کے حسن و عشق کی باتوں کو فوقیت دی گئی۔ غزل عرب سے ایران اور اس کے بعد ہندوستان میں داخل ہو کر شاعری کی روح بن گئی۔ اس طرح غزل میں ہیئت کے اعتبار سے مطلع، قافیہ، ردیف اور چار مقطع ظاہری اجزائے ترکیبی ہیں۔ ڈاکٹر سلمیٰ رفیق نے غزل کے ارتقائی سفر کو بھی چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ انہوں نے پہلے دور کو سولہویں صدی کی ابتدا سے سترہویں صدی کے آخر تک قرار دیا۔ اس دور کے اہم شعرا میں محمد قلی قطب شاہ، حسن سوقی، ولی دکنی وغیرہ کے اسما سرفہرست ہیں۔ موصوفہ نے غزل کے دوسرے دور کو اٹھارہویں صدی کی ابتدا سے اٹھارویں صدی کے آخر تک مانا ہے۔ اس دور کے اہم شعرا میں مرزا عبدالقادر بیدل، سعد اللہ گلشن، سراج الدین خاں آرزو، محمد رضا قزلباش خاں امید، آنند رام مخلص، لالہ ٹیک چند بہار دہلوی، درگا قلی خاں، نجم الدین شاہ مبارک آبرو، محمد شاکر ناجی، شیخ شرف الدین مضمون خاں آرزو، غلام مصطفیٰ خاں یک رنگ، شیخ ظہور الدین حاتم، قائم چاند پوری، مرزا مظہر جانِ جاناں، میر تقی میر، مرزا رفیع سودا، میر درد وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اُردو شاعری کے تیسرے دور کو انیسویں صدی کی ابتدا سے انیسویں صدی کے نصف اوّل تک قرار دیا گیا ہے۔ اس دور کے اہم شعرا میں مصحفی، جرأت، انشا، رنگین، ذوق، ظفر، غالب، مومن، شیفتہ، شاہ نصیر وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ موصوفہ نے اُردو شاعری کے چوتھے دور کو جدید غزل کا نام دیا ہے۔ ان کی نظر میں یہ دور انیسویں صدی کے نصف آخر سے شروع ہو کر بیسویں صدی کے ربع اوّل تک اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اس دور میں سلمیٰ رفیق نے حالی، داغ، اسیر، امیر، منیر، بحر، قلق، سلیم، صبا، جلال، اکبر، چکبست، حسرت، فانی، اصغر، فراق، جوش وغیرہ کے اسما کو شامل کیا ہے۔

ڈاکٹر سلمیٰ رفیق نے کلاسیکی شاعری کے اہم جز 'قطعہ' پر بھی تحقیقی و تنقیدی بحث کی ہے۔ اس بارے میں وہ رقم طراز ہیں کہ قطعہ وہ ہیئتی صنف ہے جو عرب سے ایران اور ایرانیوں سے اُردو میں منتقل ہوئی۔ عربی اور فارسی میں قطعہ کی مستحکم روایت اور تاریخ ہے۔

مثنوی کے معنی و مفہوم پر بھی تفصیلی اور مدلل بحث کی گئی ہے۔ غزل کے بعد اُردو میں مثنوی نے شہرت دوام حاصل کیا۔ حالی نے اس صنف کو سب سے کارآمد صنف قرار دیا ہے۔ مثنوی میں ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اُردو میں یہ صنف بہ ذریعہ فارسی داخل ہوئی ہے لیکن لفظ مثنوی

عربی النسل ہے۔ ابتدا میں اُردو مثنوی کے لیے سات بحریں مقرر تھیں۔لیکن بعض شعرا نے اس روایت سے انحراف کیا۔ سعادت یار خاں رنگین نے سات کے بجائے گیارہ بحروں میں مثنویاں لکھیں۔حکیم نجم الغنی نے اپنی کتاب بحر الفصاحت میں سات کے بجائے دیگر بحروں کا ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر سلمیٰ رفیق نے اُردو کی قدیم صنف سخن رباعی کے ایجاد پر ناقدانہ گفتگو کی ہے۔رباعی عربی لفظ ربع سے ماخوذ ہے جس کے معنی چار چار کے ہوتے ہیں۔رباعی اُردو میں فارسی شاعری کے ذریعے داخل ہوئی جب کہ لفظ رباعی عربی النسل ہے۔رباعی کا ابتدائی نام ترانہ، چہار بیتی، اور چہار مصراعی تھا۔اس کا ایک نام دوبیتی بھی ہے۔رباعی کا چوتھا مصرع سب سے جان دار ہوتا ہے۔رباعی کے لیے چوبیس اوزان مقرر ہیں۔

پروفیسر وہاج الدین علوی کی تقدیم سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سلمیٰ رفیق کو عربی و فارسی ادب بالخصوص کلاسیکی ادب سے گہرا شغف ہے۔اس لیے انہوں نے اپنے لیے اس مشکل اور سنجیدہ کام کو مخصوص کر لیا ہے۔پروفیسر احمد محفوظ نے بھی 'حرف معتبر' کے تحت ڈاکٹر سلمیٰ رفیق کے کام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ زیر نظر کتاب اس لحاظ سے زیادہ کارآمد ہے کہ اس میں غزل، مثنوی رباعی اور قطعہ پر تفصیلی مباحث سے کام لیا گیا ہے۔ڈاکٹر سلمیٰ رفیق قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے کلاسیکی شعری اصناف جیسے اہم موضوع پر قلم اٹھا کر اُردو ناقدین اور قارئین کے لیے نئی راہیں ہموار کی ہیں۔

☆ مبصر کا پتہ: وارڈ نمبر 1، مہپا چوراہا، نگر پنچایت سوال خاص، ضلع میرٹھ— 250501 (یوپی) موبائل 9897012528

□□□

پروفیسر عبدالبرکات کی تازہ تصنیف

تصوّرات وتفہیمات

ادبی مضامین کا مجموعہ

صفحات: 400 قیمت:-/445 اشاعت:2025

ISBN 978-93-90579-77-8

رابطہ: اردو بک ریویو، نئی دہلی۔ Tel. 011-44753890

غالب اور میرٹھ (جلد اوّل)

مرتب وناشر: ڈاکٹر ابراہیم افسر

تبصرہ: ڈاکٹر ثمر جہاں☆

ڈاکٹر ابراہیم افسر، معروف محقق رشید حسن خان کی محققانہ کاوشوں سے متاثر اور محنتی طالب علم ہونے کے ساتھ بحیثیت استاد درس وتدریس کے پیشے سے منسلک ہیں۔'رشید حسن خاں کی ادبی جہات' ان کے مقالے کا موضوع رہا۔اس موضوع پر ان کی کئی کتابیں داد وتحسین حاصل کر چکی ہیں۔اس کے بعد سے ہی انہوں نے تحقیق کے دیگر گوشوں تک رسائی حاصل کی ہے۔ان کی مرتب کردہ تصنیف 'غالب اور میرٹھ' ہے۔

مرزا اسداللہ خاں غالب بیسویں صدی کے نامور شاعر، نثر نگار، تاریخ نویس اور ماہر فارسی داں اور منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ غالب کی ذہنی جہتوں تک رسائی کا سلسلہ ہنوز جاری و ساری ہے ۔ غالب کی زندگی کے اہم واقعات میں 1857 کا غدر، دیوان غالب اور عود ہندی کی اشاعت، سفر کلکتہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

یہ بات اہل علم وادب کے ذہن میں ہے کہ جنگ آزادی کی پہلی لڑائی کا آغاز اتر پردیش کے شہر 'میرٹھ' سے ہوا۔ اس لیے میرٹھ کا نام تاریخ کے صفحات میں شامل ہے۔ یہ شہر بہت سے اہل علم وشاعروں کا آبائی وطن بھی رہا ہے، غالب کی زندگی کا بھی کچھ زمانہ میرٹھ میں گزرا ہے۔ابراہیم افسر کا تعلق بھی میرٹھ شہر سے ہے۔ اس اعتبار سے انہوں نے میرٹھ کے تعلق کو غالب سے جوڑ کر غالب شناسی میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''غالب اور میرٹھ (جلد اول) کو منظر عام پر لانے کا مقصد یہ ہے کہ مرزا غالب جن جن شہروں میں ذہنی زندگی کے ایام

صفحات: 544 قیمت:-/650 اشاعت:2025

ISBN 978-81-964054-5-8

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی-6

مرتب سے رابطہ: 9897012528

گزارے یا جن شہروں سے انہیں رغبت اور محبت تھی یا جن شہروں میں ان کے ناقدین اور مداحین موجود تھے۔ان سب پر کوئی نہ کوئی کتاب شائع ہو چکی ہے۔مثلاً 'غالب اور رام پور'، 'غالب اور آگرہ'، 'غالب اور باندہ'، 'غالب اور بدایوں' وغیرہ۔ اس کے علاوہ غالب کی زندگی، شاعری، فن، چشمک اور خطوط کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔میرٹھ اور غالب کے حوالے سے کوئی کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے۔۔۔دراصل میری توجہ اس جانب میرٹھ اور غالب کے تعلق سے جو مضامین لکھے گئے ہیں، ان میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کے مضمون 'غالب اور میرٹھ' کو پڑھنے سے ہوئی۔(صفحہ:57)

ابراہیم افسر نے اپنے 'مقدمہ' میں میرٹھ کی قدیم تاریخ کا ذکر کیا ہے۔انہوں نے ہر باب کا تفصیلی تعارف بھی پیش کیا ہے۔ان کا ماننا ہے کہ:

''میرٹھ کی تاریخ کئی اعتبار سے دہلی سے بھی قدیم ہے۔یہ سرزمین رشیوں، منیوں، اولیا اور صوفیوں کی آماجگاہ رہی ہے۔ رامائن اور مہابھارت کے نقوش اس خطے میں آج بھی موجود ہیں۔میرٹھ قدیم زمانے سے دہلی حکومت کے زیر سایہ رہا ہے۔ عہد سلاطین، عہد مغلیہ اور انگریزی حکومت کے ماتحت یہ علاقہ دہلی کے کنٹرول میں رہا۔''

اس تصنیف کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں طویل مقدمے کے بعد میرٹھ کی سرزمین سے وابستہ شاعروں نے غالب کو نذرانہ عقیدت کے طور پر جو غزلیں، قطعات، تاریخ وفات غالب لکھی ہیں، ان کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔دوسرے باب میں غالب کا میرٹھ سے جو تعلق رہا ہے اور جن اہم محقق و نقادوں نے اس جانب توجہ دے کر مضامین لکھے ہیں، انہیں شامل کیا ہے۔ان میں شوکت سبزواری، حکیم سیف الدین اور خود مرتب کا مضمون شامل ہے۔کتاب کے تیسرے باب میں قاطع برہان کے تصفیہ میں لکھی گئی رحیم بیگ میرٹھی کی تصنیف 'ساطع برہان' (فارسی) جو 1865 میں میں مطبع ہاشمی میرٹھ سے شائع ہوئی، اس کی تقلید اور طرز بیان پر لکھے گئے الگ الگ نقادوں کے مضامین کو یکجا کیا گیا ہے۔بالخصوص شریف الحسن قاسمی کا مقالہ قابل توجہ ہے اس طرح سے دس مقالات اس باب میں شامل ہیں۔کتاب کا چوتھا باب غالب کے خطوط کے مجموعے 'عود ہندی' میرٹھ اشاعت پر مبنی ہے۔اس باب میں بھی دس مقالات انفرادیت رکھتے ہیں۔اس میں 'عود ہندی کے پہلے ایڈیشن کا پیش لفظ' بالخصوص خلیق انجم اور دوسرے ناقدین ادب کے مضامین شامل ہیں۔باب پنجم میں میرٹھ سے تعلق رکھنے والے ان ادبا کے مقالات کو یکجا کیا ہے جنہوں نے 'دیوان غالب' کی شرح لکھی ہے۔ان میں شوکت میرٹھی کی 'حل کلیات اردو مرزا غالب دہلوی' بیان میرٹھی کی 'حل المطالب' (مولانا) عبدالباری آسی کی 'مکمل شرح دیوان غالب' کو خاص مقام حاصل ہے۔ اس باب میں غالب کے شارحین کے 16 مقالات اہم ہیں۔

ابراہیم افسر نے بڑی تگ و دو سے غالب اور ان کے کلام کے تعلق سے میرٹھ شہر سے وابستہ شعرا کے مقالات کو ایک خاص انداز فکر سے پیش کیا ہے۔ان کی تحقیقی بصیرت اس ضمن میں قابل قدر ہے۔یہ تصنیف فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ میرٹھ میں بھی غالب کے محققین، مداحین اور غالب کے پرستار رہے ہیں۔ان میں سے ایک ابراہیم افسر بھی ہیں۔یہ تصنیف غالب شناسی میں ایک اہم اضافہ ہے۔

پروفیسر فاروق بخشی نے کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے۔فلیپ پر کتاب کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیکچرار ڈاکٹر نوشاد عالم کے دعائیہ کلمات شامل ہیں۔کتاب کا ٹائٹل بھی پُرکشش ہے۔امید ہے اردو حلقے میں اسے خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوگی۔

☆ مبصر کا پتہ: 2051، کوچہ ناہر خاں، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی-110002۔موبائل: 9643084411

□□□

مقالاتِ رشید حسن خاں
(جلد دوم اور چہارم)
مرتب: ڈاکٹر ٹی آر رینا
رابطہ: اردو بک ریویو۔فون: 011-44753890

منتشر اوراق (مجموعہ مضامین)

مصنف: ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی

تبصرہ: ڈاکٹر عمران عاکف خان☆

مضامین اور مقالات جمع کرنا یا ترتیب دینا، اسی طرح ان کی تدوین اور تہذیب، یہ ایسا عمل ہے جو اُردو ادب میں عرصۂ دراز سے جاری ہے۔ بلکہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ہی اس میں نکھار، سدھار اور بناؤ سنگھار بھی آتا گیا اور اُن کا معیار و وقار بھی بلند کرنے کی مہم جوئی کی گئی ہے۔ ان مجموعوں میں اکثر و بیشتر ادبی، فنی، تنقیدی، تحقیقی، علمی، تجریدی اور سائنسی مضامین و مقالات جمع کیے جاتے ہیں۔ آج کل تو جلد سے جلد مصنف و مرتب بننے کی فکر اور طلب میں مضامین و مقالات جمع کرنے کی ایسی مقابلہ آرائی ہے کہ معیار و کوالٹی مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ دراصل وہ دیگر مصنّفین یا مقالہ نگاروں کے مضامین ہوتے ہیں اور مرتب موصوف اس شعور و آگہی سے قطعی عاری ہوتا ہے کہ مضامین کی جمع و ترتیب کے لوازمات دراصل ہیں کیا کیا اور ان کی درجہ بندی کس طرح ممکن ہے؟ علاوہ ازیں اگر وہ مضامین و مقالات خود مصنف و مرتب کے ذاتی ہیں تو اس وقت نوعیت مختلف ہوگی، کیونکہ پھر اُن ہی مقالات اور مضامین کو جمع و پیش کیا جائے گا جن کی اہمیت و افادیت خود مصنف کی نگاہ میں ہے اور اس سے عام قاری و شایق کی علمی و فکری تشنگی کا سامان بھی ہوتا ہو۔ اس کا شعور یقیناً مصنف و مضمون نگار کو ہوتا ہی ہے۔

ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی کا ترتیب کردہ مجموعہ مضامین 'منتشر اوراق' ایسا ہی مجموعہ ہے۔ اس کا مطالعہ جہاں چشم کشا اور بصیرت افروز ہے وہیں فروغ اردو زبان و ادب کا باعث بھی ہے۔ اس مجموعے میں بقول مرتب: کل 35 مضامین شامل ہیں، یہ وہ مقالات و مضامین ہیں جو انہوں نے مختلف ادبی تقریبات، کانفرنسز، سمپوزیم، ورکشاپس اور مواقع پر پڑھے یا تحریر کیے ہیں۔

صفحات: 240 قیمت:-/250 اشاعت:2018
ناشر: مصنف، 435/330، رجب گنج، ٹھاکر گنج،
لکھنؤ-226003 (یوپی)

پیش لفظ کی اگلی سطور میں ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی نے اپنی سرگزشت بیان کی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر جاں فشانی اور جی توڑ کوشش و محنت کے بل بوتے اردو دنیا میں آئے ہیں اور ادب نگاری و اس کے تقاضوں کو سمجھنے کی خاطر انہوں نے کس قدر جدو جہد اور سعی کی ہے، جس کا مظہر زیر مطالعہ کتاب ہے۔

اس گراں قدر مجموعہ میں چند قابل ذکر مضامین ہیں۔ اُن میں: 'صحافت کی اہمیت و افادیت'، 'نسیم اختر صدیقی: کچھ یادیں — کچھ باتیں'، 'فون پر گفتگو کے آداب'، 'علی جواد زیدی بہ حیثیت خاکہ نگار'، 'آہ! عبارلیح آبادی'، 'ہندی شعر و ادب کے ارتقا میں مسلمانوں کا حصہ'، 'ڈائری لکھنے کی اہمیت' اور 'بیدل مراد آبادی: حیات اور شاعری' شامل ہیں۔ ان مضامین کا مطالعہ ہی ان کی جداگانہ حیثیت اور اہمیت کا بیان ہے۔ اس میں کچھ مضامین تخلیقی نوعیت کے ہیں اور کچھ تجربے اور مشاہدے کو ظاہر کرتے ہیں، اسی طرح ان میں سے کچھ اصلاحی، فکری، سماجی اور تحریکی قسم کے مضامین ہیں۔

'منتشر اوراق' کو جمع کرنا اور اس ترتیب سے جمع کرنا کہ اُن کا انتشار اجتماع بن جائے اور ان سے افادۂ عام بھی ہو، ایک بڑے مصنف اور تجربہ کار مرتب کا ہی کمال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی نے بکھرے پھولوں کو یکجا کر کے گلدستہ تیار کر دیا، حالاں کہ یہ پھول مختلف ہیئت و رنگت اور کیفیت و خوشبو لیے ہوئے ہیں مگر جب ایک جگہ جمع ہو گئے تو ان کا انفراد مجموعہ بن گیا، اب جو خوشبو اور مہک اُن سے اٹھتی ہے وہ سوا ہی ہے۔

فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی، لکھنؤ کے تعاون سے شائع ہونے والی یہ کتاب گوناگوں خوبیوں اور کمالات کا مظہر ہے۔

یہ کتاب یقینی طور پر قابل مطالعہ اور باذوق قارئین کے لیے ایک شان دار تحفہ ہے۔

☆ مبصر کا پتہ: 3، باغ، ڈیگ روڈ، گل پاڑہ-321024، ڈیگ (راجستھان)۔ موبائل: 9911657591

□□□

ڈاکٹر شمس بدایونی کی دو نئی تصانیف

رموز و اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟

صفحات: 218 قیمت: -/300 اشاعت: 2024

ISBN 978-81-970897-6-3

غالب: کچھ تحقیق، کچھ تنقید

صفحات: 407 قیمت: -/650 اشاعت: 2025

ISBN 978-93-6691-273-8

ملنے کا پتہ: اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی - ۲

Tel. 011-44753890 / 9953630788

اُردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات

ادب کے طالب علموں اور اسکالرز کے لیے

ترمیم و اضافے کے ساتھ (چوتھا ایڈیشن)

مصنف: ڈاکٹر سیّد تنویر حسین

ISBN 978-93-90579-98-3

صفحات: 224 قیمت: -/300 اشاعت: 2023

رابطہ: اردو بک ریویو، نئی دہلی۔

Tel. 011-44753890 / 9953630788

مظہر العلوم ایجوکیشنل چیریٹیبل ٹرسٹ (رجسٹرڈ) دہلی

شاہی امام مسجد فتح پوری دہلی مفکر ملت مفتی اعظم مولانا ڈاکٹر مفتی محمد مکرم احمد صاحب کی سرپرستی میں عوامی فلاح و بہبود کے مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے مظہر العلوم ایجوکیشنل چیریٹیبل ٹرسٹ کا قیام عمل میں آچکا ہے، جس سے مستحقین اور ضرورت مند عوام، طلبا اور طالبات کی خدمت و معاونت کا سلسلہ جاری ہے۔ انکم ٹیکس ڈپارٹمنٹ کی طرف سے 12A اور 80G بھی مل گیا ہے۔ اس ٹرسٹ کا اصل مقصد مذہبی اور عصری تعلیم و تربیت کا فروغ، صحت اور انسانی خدمت ہے۔ مزید معلومات کے لیے موبائل نمبر پر رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

نوٹ: اہل خیر حضرات سے تعاون کی درخواست ہے۔

حماد احمد

Mazharul Uloom Educational Charitable Trust (Regd.)

6479/11, G.F., Katra Bariyan, Fatehpuri, Delhi - 110006

Axis Bank (Chandni Chowk Branch)

A/c No. 920010070673650 IFSC: UTIB0000254

Bombay Mercantile Co-Operative Bank Limited

A/c No. 200100100068463 IFSC: UTIB0SBMCB1

The Trust has exemption from Income Tax Under 12A & 80G

Email: trust.mueducation@gmail.com **Mobile: 9899663435 / 9873684293**

Advtt./01/2025

جائزہ اُردو کتب ورسائل

حیاتِ انقلاب
ڈاکٹر محمد قطب الدین ابوشجاع
حیات وخدمات اورآثار وافکار

مصنف: مفتی سیّد آصف الدین ندوی قاسمی، ایم اے
صفحات: 8+152، قیمت :-/200، اشاعت: جنوری 2025
ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف عربک اسٹڈیز، 13-6-437/A/85/2
ایم ایس ریذیڈنسی، قادر باغ، نانل نگر، حیدرآباد-500008 (تلنگانہ)
Mobile: 9849611686

——— از: محمد عارف اقبال

امریکہ میں مقیم ماہر نفسیات (Psychiatrist) ڈاکٹر محمد قطب الدین ابوشجاع (پ:12 نومبر 1956) حیدرآباد (دکن) کے ایک دینی علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد امریکہ کی یونیورسٹی آف مسوری سے ایم ڈی کیا اور انسانی نفسیات میں مہارت حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے کلینکل سائیکولوجی میں پی ایچ. ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹر محمد قطب الدین کی شخصیت بڑی دلآویز ہے۔ وہ ایسے طبیب ہیں جن کے دل میں اپنے مریضوں کے لیے ہمیشہ ہمدردی اور خیرخواہی ہوتی ہے۔ ان کی شخصیت علمی بھی ہے اور سماجی بھی۔ گزشتہ تقریباً 40 برسوں سے اپنی علمی وسماجی خدمات کے سبب ان کی شخصیت بین الاقوامی ہوچکی ہے۔ ان کے گھریلو روابط معروف عالمی باکسر محمد علی سے رہے۔ ابن خلدون یونیورسٹی ترکیہ سمیت دنیا کی کئی یونیورسٹیز میں وہ وزیٹنگ پروفیسر ہیں۔

اس کتاب کے مصنف و مرتب مفتی سیّد محمد آصف الدین صاحب ندوی اور قاسمی دونوں ہیں۔ انہوں نے انگلش اینڈ فارن لنگویجز یونیورسٹی حیدرآباد گریڈ (A) سے عربی میں ایم اے کی ڈگری بھی لی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف عربک اسٹڈیز (حیدرآباد) جس کے وہ بانی ہیں، 2005 سے تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ موصوف خود حیدرآباد کے رہنے والے ہیں اور شاید اسی وجہ سے انہوں نے ڈاکٹر محمد قطب الدین کی خدمات سے متاثر ہوکر، ان کی انقلابی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لیے زیر نظر کتاب 'حیاتِ انقلاب' کو ترتیب دینے کا بیڑہ اٹھایا۔ وہ اپنی اس کتاب کے 'پیش لفظ' میں اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے 2021 میں ڈاکٹر قطب الدین (ماہر نفسیات) کی شخصیت پر 'قطب نامہ' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جسے بے حد پسند کیا گیا۔ اس کے بعد ہی ان کے دل میں یہ خیال راسخ ہوگیا کہ ڈاکٹر قطب الدین ابوشجاع کی گراں قدر خدمات کو اجاگر کرنے کے لیے ایک کتاب تیار کریں گے۔ اس کتاب کے لیے انہوں نے راقم سے رابطہ کیا۔ لہٰذا اس میں میرا مضمون بھی شامل ہے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اس کتاب کا مبصر کوئی اور ہوتا... لیکن آصف الدین ندوی صاحب کے مسلسل اصرار پر راقم کو ہی یہ ذمہ داری ادا کرنی پڑی ہے۔

زیر نظر کتاب امریکی ماہر نفسیات 'ڈاکٹر محمد قطب الدین ابوشجاع: حیات وخدمات اورآثار وافکار' کو تین حصے میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصے کو مصنف نے اپنی تحریروں سے مزین کیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر قطب الدین کی شخصیت، تعلیمی، تدریسی اور سماجی زندگی کے ساتھ اردو سے ان کی محبت اور دین اسلام سے ان کے عشق کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کے اس پہلے حصہ میں سفر حج وعمرہ، ارض القرآن کا سفر اور ڈاکٹر قطب الدین کی علمی و ادبی کوششوں کا خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے۔ حال ہی میں شائع ہونے والی دو کتابیں 'حیات عزم و ہمت' (مرتب: ڈاکٹر تبریز حسین تاج) اور 'کوہ نور' (مصنف: سیّد خالد شہباز) کا تعارف نامہ بھی شامل ہے۔ 'پیام فکر وتدبر' ڈاکٹر محمد قطب الدین کی مرتب کردہ کتاب 2016 میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کے ادبی وعلمی ذوق کو سراہا گیا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا حصہ جن ادیبوں اور دانشوروں کے مضامین پر مشتمل ہے ان میں دیگر ناموں کے علاوہ پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر محمد لقمان خان، ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، ڈاکٹر

فاضل حسین پرویز، سیّد جلیل از ہر اور ظہیر ناصری کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

کتاب کا تیسرا حصہ دراصل ڈاکٹر قطب الدین کے لکھے ہوئے مضامین ہیں جو اخبارات و رسائل وغیرہ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس میں موضوع کا تنوع ہے اور فکر کی گہرائی بھی ہے۔ چند عنوانات اس طرح ہیں: رمضان بطور مرشد، سگمنڈ فرائڈ اور علامہ اقبال ایک مطالعہ، اتحاد امت کی دعوت، حکیم محمد اجمل خاں، تحریک تحفظ اردو، کھانا ضائع نہ کریں: انسانیت کی پکار، علامہ اقبال: بطور ایک ماہر نفسیات وغیرہ۔

کتاب کے مصنف نے ہندوستانی نژاد شہرہ آفاق امریکی ماہر نفسیات ڈاکٹر محمد قطب الدین کی حیات و خدمات اور آثار و افکار کو حتی المقدور اس کتاب میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ توقع ہے کہ ڈاکٹر صاحب پر تحقیقی کام کرنے والوں کو ابتدائی طور پر بڑی مدد مل سکتی ہے۔ کتاب کے مصنف مبارکباد کے مستحق ہیں۔

□□□

بھیگی ہوئی سگریٹ (افسانوں کا مجموعہ)

افسانہ نگار: **مشتاق اعظمی**

صفحات: 128، قیمت: -/350، اشاعت: 2023
ناشر: قاضی محمد زکریا، (Matterlink Publishers)،
1870، پہلی منزل، لکھراج ڈالر، اندرانگر، لکھنؤ۔ (یوپی)
Mobile: 9002140625

——— از: شکیل رشید☆

ڈاکٹر مشتاق اعظمی (پ: 3 نومبر 1944) بنیادی طور پر اردو کے استاد رہے ہیں۔ ان کی تدریسی خدمات تقریباً 35 برسوں کو محیط ہے۔ رانی گنج کے ٹی ڈی بی کالج سے بحیثیت ریڈر اور صدر شعبہ اردو تقریباً 20 سال قبل ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ خود کو اعظمی کہتے ہیں لیکن آسنسول (مغربی بنگال) کو انہوں نے وطن ثانی بنالیا ہے۔ ان کے گھر کا نام 'اعظمی مینشن' ہے۔ ان کا شمار ان اہل علم و ادب میں ہوتا ہے جن کو جنون کی حد تک کتابوں سے عشق ہے۔ مشتاق اعظمی کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں، کتاب خواہ سرحد پار سے کیوں نہ منگوانی پڑے۔ وہ اپنے گھر کی ذاتی لائبریری کو خاص رحمتِ خداوندی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس قحط الرجال میں ڈاکٹر مشتاق اعظمی کی شخصیت اردو سے وابستہ پروفیسرز کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔

'بھیگی ہوئی سگریٹ' افسانوں کے اس مجموعہ کا نام ہے جس میں اٹھارہ افسانے شامل ہیں۔ ترتیب کے لحاظ سے پانچواں افسانہ 'بھیگی ہوئی سگریٹ' ہے۔ اس کتاب کا 'دیباچہ' ڈاکٹر مشتاق اعظمی کے دیرینہ دوست فیروز عابد صاحب نے کتاب کی اشاعت سے تقریباً تیرہ سال قبل (13 جنوری 2012) لکھا تھا۔ فیروز عابد نے اپنے اس 'دیباچہ' میں اپنی دوستی کا حق اس طرح ادا کیا ہے کہ مشتاق اعظمی کی شخصیت کے کئی راز افشا کردیے ہیں۔ ایک راز تو یہ ہے کہ کلکتہ کے عطاءالرحمٰن شاد (وفات: 31 مارچ 2015) نے سرحد پار سے نکلنے والے اردو ڈائجسٹ کی طرز پر 'فانوس' کے نام سے کلکتہ سے ایک ڈائجسٹ نکالا تھا۔ اس کی مجلس مشاورت میں مشتاق اعظمی، غلام محمد اختر اور فیروز سلطان اعجاز (ف س اعجاز) تھے۔ یہ ہندوستان کا پہلا اردو ڈائجسٹ تھا اور اس کے صرف 13 شمارے نکل سکے۔ 'ہما' اور 'شبستاں' کی اشاعت بعد میں ہوئی تھی۔ فیروز عابد لکھتے ہیں:

''مشتاق اعظمی کے سلسلے میں یہ کہنا غالباً بہت ضروری ہے کہ اس کے چاہنے والے جہاں میری طرح ادب کے طفلِ مکتب ہیں وہاں پاکستان کے کچھ نامور لوگ بھی ہیں۔ مشتاق اعظمی نہ کردار کا غازی اور نہ گفتار کا غازی ہے۔ مشتاق اعظمی ایک سیدھا سادہ انسان ہے جو سماجی اور نفسیاتی کہانیاں لکھتا ہے۔ دوستوں سے محبت کرتا ہے۔ دشمنوں کو رحم کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور کسی کی بدگوئی نہیں کرتا۔''

فیروز عابد کے بقول ''مشتاق اعظمی کے بیشتر افسانوں میں نفسیاتی کشمکش بھی ہے۔ یہ کشمکش نہ فلسفہ ہے اور نہ زاویۂ نگاہ بلکہ کرداروں کو پیش کرتے ہوئے کہانی کے بطون سے جو سرد گرم تاثرات ابھرتے ہیں وہ نفسیاتی کیفیت کے اظہار کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔''

مشتاق اعظمی کا تیسرا افسانوی مجموعہ 'بھیگی ہوئی سگریٹ' (باماجرا اور نیم علامتی افسانے) اپنے اسلوب، ٹریٹمنٹ اور

اپنے بیانیہ کی ندرت سے لوگوں کو چونکا گیا۔ اس افسانوی مجموعہ سے قبل موصوف کے دو افسانوی مجموعے 'آدھا آدمی' اور 'نارسیدہ' شائع ہو کر قارئین سے داد وتحسین وصول کر چکے ہیں۔ تینوں ہی مجموعوں میں ایک قدر مشترک ہے؛ زندگی۔ مشتاق اعظمی کے افسانوں کی فضا الگ ہوسکتی ہے، ان کے موضوعات میں تنوع بھی ہوسکتا ہے، لیکن ان کے افسانوں سے زندگی غائب نہیں ہوسکتی، زندگی ہر شکل میں نظر آتی ہے؛ تلخ اور کرب میں ڈوبی ہوئی اور طرح طرح کے تجربات سے گزرتی ہوئی۔ پاکستان کے معروف نقاد انور سدید کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

''مجھے یہ تو علم نہیں کہ مشتاق اعظمی کے پاس کسی مخصوص نظریے کی عینک ہے یا نہیں، لیکن ان کے افسانے پڑھ کر یہ احساس قوی ہوجاتا ہے کہ وہ کسی مخصوص نظریے کی تبلیغ نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہماری زندگی کی ایک ایسی حقیقی قاش پیش کر رہے ہیں جو اُن کے تجربے کا حصہ بن گئی اور ان کے باطن میں گھمسان کا رَن بپا کر گئی تو وہ اسے افسانے میں پیش کرنے پر مجبور ہو گئے کہ اپنا کیتھارسس کر سکیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے افسانہ لکھ کر اپنا سکون بحال کر لیا لیکن حقیقت کی داخلی بے کلی قاری کو منتقل کر دی۔''

ایک قاری کے طور پر میں نے بھی داخلی بے کلی محسوس کی ہے۔ ٹائٹل کہانی 'بھیگی ہوئی سگریٹ' کی مثال لے لیں، جو سنتھالی مزدوروں اور کامنوں (تعمیراتی کام کرنے والی مزدور عورتیں) کی زندگی کو پرت در پرت کھولتی ہے، اور اس کی روشنی میں سفید پوش چہروں کی بے حیائی کو عیاں کرتی ہے۔ اس کہانی کا اختتامیہ پڑھنے والوں کو بے کل کر جاتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''ایک دن جب وہ کامن سیمنٹ کا بستہ لینے کے لیے آئی تو محمود گویا پہلے سے ارادہ کیے بیٹھا تھا۔ اس نے کامن کے سر پر سیمنٹ کا بستہ رکھنے کے ساتھ ہی اس کا بازو زور سے دبا دیا۔ اس کو امید تھی کہ اس کا مقصد بھانپ کر وہ کہے گی 'دس ٹاکا'!... لیکن جب محمود کا ہاتھ اس نے پوری طاقت کے ساتھ جھٹک دیا تو اس کی چٹان میں انگلیاں چھونے کی آرزو سیمنٹ اور ریت کے آمیزے میں شامل ہو کر اینٹوں کے نیچے دفن ہو گئی۔''

پروفیسر اعزاز افضل اور علقمہ شبلی کی رائے کتاب کے دائیں اور بائیں فلیپ پر دی گئی ہے۔ علقمہ شبلی (مرحوم) کی رائے ہے کہ ''مشتاق اعظمی عہد حاضر کے معتبر افسانہ نگار ہیں... مشتاق اعظمی کا انداز بیاں شگفتہ اور اسلوب دلکش ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں۔''

☆ مبصر کا پتہ: ایڈیٹر، روزنامہ ممبئی اردو نیوز، 101 فدا ہاؤس، فرسٹ فلور، مولانا آزاد روڈ، ممبئی-400008

Email: khansh.rasheed@gmail.com

□□□

STAWA (Leh-Ladakh)

In Memoria Abdul Ghani Sheikh
(1936-2024)
Editor: Sunetro Ghosal
Guest Editor: Monisha Ahmed
Vol. 11, Issue 9, September 2024
Pages: 44, Rs. 40/-
Address: Stawa, PO Box 75,
Leh-Ladakh - 194101, Tel. +91 1982 258004

از: محمد عارف اقبال

Stawa غالباً لداخی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی اس انگریزی رسالہ کے ایک گوشے میں Perspective یا Point of View لکھا گیا ہے۔ اس لیے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ لیہ لداخ کے ماضی کی یافت یا اس کے تاریخی ورثے اور ثقافت کی بازیافت کے لیے یہ رسالہ ہر تعلیم یافتہ اور باشعور انسان کی توجہ مبذول کرانے کی قوت رکھتا ہے۔

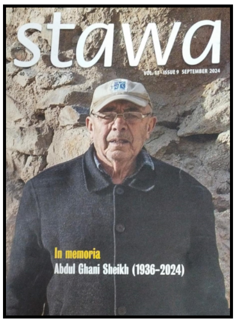

زیر نظر رسالہ (ستمبر 2024) میں لیہ کی ایک ایسی لیجنڈ شخصیت کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے جس کا نام ہے عبدالغنی شیخ۔ لداخ کی تاریخ و ثقافت کے ماہر، ممتاز محقق

اور اردو زبان کے معروف ناول و افسانہ نگار عبدالغنی شیخ منگل 20 اگست 2024 کو انتقال کر گئے۔ ان کی تدفین لیہ لداخ کے قدیم قبرستان میں ہوئی۔ مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹی ڈاکٹر یاسمین اور دو بیٹے ڈاکٹر محمد اقبال اور شاہد لطیف شامل ہیں۔

عبدالغنی شیخ 5 مارچ 1936 کو لیہ (لداخ) میں پیدا ہوئے۔ ان کی مادری زبان لداخی تھی لیکن ذریعہ تعلیم اردو ہی رہی۔ اردو سے ان کو غیر معمولی انسیت تھی۔

انگریزی رسالہ Stawa (شمارہ ستمبر 2024) میں بجا طور سے ایک معروف و ممتاز لداخی تاریخ و ثقافت کے محقق کو بڑے خوبصورت انداز سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ مکمل رسالہ عبدالغنی شیخ کی نذر ہے۔ اس رسالہ کی مہمان ایڈیٹر مونیشا احمد نے اپنے اداریہ میں لکھا ہے کہ عبدالغنی شیخ کو اس لیے بھی یاد کیا جاتا رہے گا کہ وہ انٹرنیشنل ایسوسی ایشن فار لداخ اسٹڈیز (IALS) کے لیے 1990 سے غیر معمولی طور پر متحرک رہے۔ انہوں نے اس ایسوسی ایشن (IALS) کی جانب سے ہونے والی کانفرنسز جو جرمنی، ڈینمارک، انگلینڈ اور روم میں منعقد ہوئیں، لداخ کی نمائندگی کی۔ عبدالغنی شیخ کی حیثیت اس طور پر تسلیم کی جاتی تھی کہ ان کے بین الاقوامی سطح کے دوست اور اسکالرز دور دراز مقام سے لیہ لداخ کا سفر کرتے اور عبدالغنی شیخ سے رہنمائی (Guidance) حاصل کرتے۔ اس رسالہ میں عبدالغنی شیخ کی خدمات پر جن افراد کے مضامین شامل ہیں ان میں رسالہ کے ایڈیٹر کے علاوہ Rev Elijah Spalbar، ماہر تعلیم Tsering Samphel Gergan، نیدر لینڈر یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر رادھیکا گپتا، سنگاپور کے تاریخ داں John Bray، تاریخ کے پروفیسر صدیق واحد، مرتضیٰ فاضلی، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر کے سابق سکریٹری خالد بشیر احمد، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے اسسٹنٹ پروفیسر مظفر حسین ٹانگر ہونگ، آرٹ کنزویٹر نور جہاں، عدینہ آرا اور ادیبہ جہاں، فروزین میڈیا گروپ کے ایڈیٹر آصف مجتبیٰ شامل ہیں۔ عبدالغنی شیخ کے چند مضامین بھی شامل ہیں جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ابتدائی زندگی کس قدر آزمائشوں سے بھری ہوئی تھی۔ انہوں نے لیہ (لداخ) میں وہاں کی تاریخی وراثت کو محفوظ کرنے میں کتنا اہم کردار ادا کیا۔ ان کے مضامین کے نام اس طرح ہیں:

Leh of my childhood, Transforamtion of Kuksho Village, Islami Architecture in Ladakh.

عبدالغنی شیخ کی اردو اور انگریزی میں 1976 سے 2022 تک 18 کے قریب کتابیں شائع ہوئیں۔ درجنوں مضامین شائع ہوئے۔ کئی تحقیقی مقالات نے داد و تحسین حاصل کی۔ 1995 میں ان کا ایک مقالہ چھپا تھا، عنوان ہے:

A Brief History of Muslims in Ladakh.

اردو میں عبدالغنی شیخ کی جن کتابوں کو پذیرائی ملی ان میں وہ زمانہ (ناول)، دل ہی تو ہے (ناول)، لداخ کی سیر، کتابوں کی دنیا، گاندھی جی اور ان کا فلسفہ، قلم۔قلم کار اور کتاب، لداخ تہذیب و ثقافت، اسلام اور سائنس، دو ملک ایک کہانی (افسانے)، لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے، لداخ: محققین اور سیاحوں کی نظر میں، خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

انگریزی کے اس رسالہ نے عبدالغنی شیخ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے جس شان سے خراج عقیدت پیش کیا ہے، اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عبدالغنی شیخ جن کی اردو مادری زبان نہ ہوتے ہوئے بھی اردو کی بے مثال خدمت کی، اردو والوں کو توفیق نہیں ہوئی کہ کم سے کم انتقال کے بعد سہی، عبدالغنی شیخ کی تخلیقی خدمات کا اعتراف کرتے، ان کی خدمات پر پی ایچ. ڈی کے مقالے لکھوائے جاتے۔

□□□

عکسِ جمیل (شخصیات پر تاثراتی مضامین کا مجموعہ)

مصنف: **عارف عزیز**، مرتب: **نعمت اللہ ندوی**

صفحات: 202، قیمت: -/500، اشاعت: 2022

ISBN 978-93-93785-80-0

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی-2

از: ایم نصراللہ نصر ☆

زیر مطالعہ کتاب 'عکسِ جمیل' نعمت اللہ ندوی کی ترتیب کردہ کتاب ہے۔ اس میں بھوپال کے بزرگ صحافی اور ادیب

عارف عزیز کے منتخب مضامین کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں آغاز کے تین مضامین کے علاوہ چار ابواب شامل ہیں۔ پہلے باب میں تیرہ مضامین [پیغمبر اسلام، قاری محمد طیب صدیقی، ابوالحسن علی حسنی ندوی، (مولانا) اسعد مدنی، (مولانا) رابع حسنی مدنی ،مفتی عبدالرزاق خاں، (مولانا) وحیدالدین خاں، حافظ سراج الحسن، شرافت علی ندوی اور مفتی رحیم اللہ پر مضامین] شامل ہیں۔ دوسرے باب میں 6 مضامین (ٹیپو سلطان، گرونا نک، مہاتما گاندھی، سردار بھگت سنگھ اور جے پرکاش نرائن)۔ تیسرے باب میں دس مضامین (جمال عبدالناصر، گیانی ذیل سنگھ، پروفیسر آفاق احمد، ڈاکٹر نصرت مہدی، ڈاکٹر محمد نعمان خاں، محمد ادریس مونس، حاجی غلام محمد، عارف جنید ندوی، رضیہ خاتون اور حافظ عامر عزیز) اور چوتھے باب میں اٹھارہ مضامین (مولوی محمد باقر، محمد علی جوہر، جوش ملیح آبادی، مہاشہ کرشن، حیات اللہ انصاری، سید قمر الحسن، قدوس صہبائی، عابد علی، ش — مظفر پوری، احمد سعید ملیح آبادی، محمد وسیم الحق، عزیز برنی، انعام اللہ خاں اودھی، اشفاق مشہدی ندوی، پرویز جمال باری، سید عارف حسن، مسلم سلیم اور آر — کے — کیسوانی) جیسی شخصیات پر اہم مضامین زینت قرطاس ہیں۔

یہ سارے مضامین وقفہ وقفہ سے تقریباً نصف صدی کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے قاری ادب، صحافت اور اسلامیات کے اکابر سے متعارف ہوسکتا ہے۔

عارف عزیز بنیادی طور پر صحافت سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ رپورٹنگ، کالم نگاری، اداریہ نگاری، فیچرس، مضمون نگاری، خاکہ نگاری، سیرت نویسی، مکالمہ، انٹرویوز اور سفرنامہ نویسی سے بھی علاقہ رکھتے ہیں۔ ان کے دل میں ملک، قوم اور شخصیات کا بڑا درد ہے۔ کہا گیا ہے کہ ان کے سیاسی، سماجی، تعلیمی، اخلاقی اور مذہبی و معاشرتی موضوعات پر چالیس ہزار سے زائد فیچرس، اداریے، کالم، شخصی خاکے اور مضامین زیور قرطاس ہیں۔ اس سے ان کے وسیع مطالعے اور بسیار نویسی کا اندازہ خوب ہوتا ہے۔ ان کے قلم میں جولانی ہے اور تحریر میں تازگی وتنوع ،فکر میں بالیدگی اور خیال میں گہرائی و گیرائی بھی۔ وہ بہت سنجیدہ اور تدبر وتوازن رکھنے والے انسان ہیں۔ ان کے مضامین کے مطالعے سے قاری نہ صرف ان عظیم شخصیات کے کارناموں سے فیضیاب ہوسکتا ہے بلکہ ان کے اسلوب اور انداز بیان سے بھی واقف ہوسکتا ہے۔ ان کی طرز تحریر کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

''حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب کے وصال کے ساتھ پورا ایک عہد ختم ہو گیا۔ بیسویں صدی کے مسلم علما و فضلا اور رہنماؤں کی محفل میں اب سے چند برس قبل تک کافی رونق اور چہل پہل تھی، آج دو چار ہی اپنے عہد کی نشانی اور اس نسل کے آخری نام لیواؤں کے طور پر رہ گئے ہیں۔'' (حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صدیقی۔ عکس جمیل ص ۲۷)

''جب تک ٹیپو سلطان برسر اقتدار رہے انہوں نے ملک کے اندر کوئی چیز باہر سے نہ آنے دی یہاں تک کہ نمک بھی یہیں تیار ہونے لگا۔ اسی طرح اسلحہ سازی سے لے کر کپڑے، برتنوں کی تیاری، لکڑی کے سامان، ریشمی مصنوعات اور لوہے ہاتھی دانت وغیرہ کی صنعت میں میسور ریاست نہ صرف خود کفیل ہوگئی بلکہ اتنا سامان ہر سال تیار کرنے لگی کہ ریاست سے باہر بھیجا جاتا۔'' (ہندوستان کے مصلح وحکمراں ٹیپو سلطان شہید۔ ص ۴۷)

'''اردو صحافت کا آغاز اخبار 'جام جہاں نما' سے ہوتا ہے لیکن اس کی نئی صورت گری کرنے والے مولوی محمد باقر تھے۔ انہوں نے 'دہلی اخبار' جاری کیا۔ جو بعد میں 'دہلی اردو اخبار' کے نام سے مشہور ہوا۔ اسے اردو کی خبری صحافت کا نقطۂ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے مولوی محمد باقر شمالی ہند میں اردو صحافت کے بانی ہی نہیں بلکہ وہ پہلے صحافی تھے جنہوں نے صحافت کے پیشہ کو مجاہدہ و مشن میں تبدیل کرنے کا کام انجام دیا اور اسی صحافتی جہاد میں انہیں شہادت کی معراج بھی حاصل ہوئی۔'' (صحافت کے پہلے شہید، مولوی محمد باقر۔ ص ۱۴۲)

مذکورہ اقتباسات کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ عارف عزیز کو ہر اصناف فن میں کمال حاصل ہے۔ ان کے یہاں مدبرانہ صلاحیت اور صحافتی مہارت کی کمی نہیں۔ بات کہنے اور جملے تراشنے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے۔

☆ مبصر کا پتہ: شالیمار اپارٹمنٹ، 3/A ستین بوس روڈ، بلاک C، بکولتا، ہاوڑہ-711109 (مغربی بنگال) موبائل: 9339976034

❑❑❑

English for Madrasa Students

انگلش برائے طلباء مدارس (مکمل 9 حصے)

مرتبین: **ابصار احمد علوی** (ایم اے، انگلش علیگ)

راشد علی (فاضل دیوبند)

دہلی میں ملنے کا پتہ: النور پبلی کیشنز، مالویہ نگر، نئی دہلی-110017

رابطہ: 9654106460 - 8755561666

از: محمد عارف اقبال

'انگلش برائے طلباء مدارس' کے نام ہی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب یا 'مجلّہ' مدارس کے طلبا کے لیے ہے۔ اس کتاب کے پہلے حصے کی اشاعت مئی 2016 میں ہوئی تھی اور اس کا نواں حصہ نومبر 2022 میں منظر عام پر آیا۔ اس طرح 9 حصوں پر مشتمل اس کتاب کی ترتیب و اشاعت میں تقریباً سات سال کا عرصہ لگا۔ اس کتاب (9 حصے) کا بنیادی مقصد جیسا کہ اس کی تمہید میں درج ہے، یہ ہے کہ مدارس کے طلبا کسی معلم کے بغیر آسانی سے انگلش سیکھنے کی طرف مائل ہوجائیں۔ حصہ اول کی تمہید میں لکھا گیا ہے کہ "... مدارس دینیہ کے طلباء مدرس کے تعلیمی سالوں کے دوران ہی اتنی انگریزی سیکھ جائیں کہ فراغت کے بعد اگر چاہیں تو بہت قلیل عرصہ میں ذاتی مطالعہ کے ذریعے اس زبان پر مطلوبہ معیاری قدرت حاصل کرلیں۔"

مدارس اسلامیہ کا ایک المیہ یہ رہا ہے کہ اردو زبان بھی بطور مضمون وہاں نصاب میں داخل نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مدارس میں تدریس کی زبان 'اردو' ہی ہے۔ انگریزی کا معاملہ کچھ زیادہ ہی پیچیدہ ہے۔ انگریزوں کی حکمرانی کے دور میں جبکہ انگلش ایک اہم زبان کے طور پر اسکولوں میں پڑھائی جانے لگی تو اس وقت علماء مدارس نے انگلش کی سخت مخالفت کی۔ انگلش کے تئیں علماء مدارس کے تنفر نے نہ صرف مدارس اسلامیہ کے طلبا کو عظیم خسارے سے دوچار کیا بلکہ اس تنفر سے 'دین اسلام' کی شبیہ اہل وطن کے سامنے مسخ ہوکر رہ گئی۔ بہرحال اس وقت میرا موضوع یہ نہیں ہے۔

ابصار احمد علوی صاحب اور راشد علی صاحب نے طلباء مدارس کے لیے انگلش سیکھنے کی یہ سیریز مرتب کرکے بڑا کام کیا ہے۔ اس کتاب سے طلبا کس حد تک فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ تاہم مرتبین کو شاید کچھ اندازہ ہو۔

اس مبصر کے خیال میں بہتر تو یہ ہے کہ ہندوستان کے مدارس اسلامیہ کو اب بھی ہوش کے ناخن لینا چاہیے۔ ساتھ ہی مدارس میں ابتدائی درجات سے انگلش کے ساتھ اردو زبان کو باضابطہ نصاب میں شامل کرکے کوالیفائڈ اساتذہ کو یقینی بنائیں۔ زبان سیکھنے کے کچھ بنیادی اصول ہوتے ہیں۔ معاون کتابوں سے کماحقہ زبان سیکھنا ممکن نہیں ہے۔ ان زبانوں کی تدریس اسی انداز سے کی جائے جس طرح مدارس میں عربی اور دیگر کتابوں کی تدریس کی جاتی ہے۔ اس کے بعد ہی مثبت نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ کاش اسلام کے نام پر قائم مدارس میں اسلام کے دعوتی پہلو پر اول روز سے غور کیا جاتا تو کسی بھی زبان کو سیکھنے یا سکھانے کا مسئلہ ہی نہیں ہوتا۔ ہمارے اکابر میں کئی حضرات رہے ہیں جو عربی، فارسی کے ساتھ انگریزی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ ان میں بعض ترکی اور فرانسیسی زبانوں سے بھی واقف تھے۔

بہرحال انگریزی سیکھنے کے لیے یہ معاون کتابیں طلباء مدارس کے لیے کارآمد ہیں۔ لیکن اس کتاب سے فائدہ اٹھاتے وقت طلبا اپنے کسی قریبی انگریزی کے استاد سے مدد ضرور لیں تاکہ تلفظ اور صوتیات کے اعتبار سے الفاظ کی ادائی میں دشواری نہ ہو۔

□□□

محترم قارئین!

اپنا زرتعاون وقت پر ارسال کرتے رہیں۔ براہ کرم ادارے کی طرف سے یاددہانی کا انتظار نہ کریں۔ یہ دستاویزی مجلّہ آپ کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ تیس برس کی مسلسل اشاعت کے باوجود ادارہ 'اردو بک ریویو' مالی بحران کا شکار ہے۔

کلیاتِ قیصر

شاعر: قیصر الجعفری

صفحات: 560، قیمت: -/499، اشاعت: 2023
ناشر: قیصر الجعفری فاؤنڈیشن، ممبئی۔
کتاب کے حصول کے لیے رابطہ: 9987792355

از: ندیم صدیقی☆

کچھ فنکار اور بعض عالم جیتے جی ہی اپنی آئندہ زندگی کی جھلک دیکھ لیتے ہیں۔ اس کے برعکس بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ زندگی جن کو اپنا محرَم ہی نہیں سمجھتی اور انہیں اس کا ادراک بھی نہیں ہو پاتا۔ ہمارے عہد اور عروس البلاد ممبئی میں قیصر الجعفری ایک ایسے ہی شاعر گزرے ہیں کہ جن کو زندگی نے خود سلام کیا اور عمر بھر کلام کیا اور زندگی کے اس سلام کا سبب قیصر الجعفری کی مسلسل اور بے تکان سعیٔ و جستجو کا عمل ہے۔ دُنیا میں ایسے بھی گزرے ہیں جو سعیٔ و جستجو کے علَم بردار تو رہے مگر ان کے نتائج اُن سے پردہ کیے رہے۔ قیصر الجعفری کی شعری فتوحات پر بغائر نظر ڈالیے تو محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے شاعری پر اگر اپنے وجود کو نثار کیا تو شاعری نے بھی اُن کا حق اُن پر وار دِیا۔ دُنیا ایک بازار کی مانند ہے، یہاں 'کچھ' ادا کیجیے تو پھر کہیں 'کچھ' آپ کے ہاتھ لگتا ہے۔ قیصر الجعفری نے اس بازار میں اپنی فکر و فن سے جو قیمت ادا کی تو بازار نے بھی انہیں خالی ہاتھ نہیں لوٹایا، ہمارے پیشِ نظر اس وقت 'کلیاتِ قیصر' ہے۔ یہ اُن کے چار شعری مجموعے اور ان کی ایک بیاض کا مجموعہ ہے، جسے بڑے سلیقے سے بلکہ حسنِ اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

قیصر الجعفری ایک سڑک حادثے میں جاں بحق ہوئے، موت کے ہاتھ اُن کا جسدِ خاکی ہی لگا۔ آج اس سانحے کو بیس برس ہو رہے ہیں، وہ اپنے فکر و فن میں اسی طرح سانسیں لے رہے ہیں جس طرح اکتوبر 2005 سے قبل وہ کہہ رہے تھے:

سفر پہ نکلنا ہے جس کو وہ جاگے
ٹھہرتا نہیں وقت، آواز دے کر

قیصر الجعفری نِرے شاعر نہیں تھے وہ جو کہا جاتا ہے کہ ایک اچھا انسان ہی اچھا شاعر ہو سکتا ہے، اس اصول پر قیصؔر مرحوم کھرے اُترتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شخصی اور شعری کردار میں اکثر انسانیت کی روشنی محسوس کی جاتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ممبئی میں ساز و آواز اور شاعری کا غُلغلہ تھا۔ ایک سے ایک مغنّی کی محفلیں لوگوں کو جگائے رکھتی تھیں، قیصر الجعفری اس عہد کے کچھ بعد سامنے آئے اور اُن کا کلام بھی اپنے وقت کے گانے والوں نے گایا اور سُننے والوں کے دِلوں کو گرمایا۔

1975 کے بعد کا زمانہ رہا ہوگا، جب روزنامہ ہندوستان (ممبئی) کے ادبی صفحے کو جواں مرگ اسماعیل پٹیل عرف صبا نظامی مرتب کرتے تھے۔ اس نوجوان نے قیصر الجعفری سے اپنے صفحے کے لیے غزل کی فرمائش کی موصوف نے اُسی وقت کاغذ پر ایک غزل لکھ کر دے دی۔ مطلع ہے:

دیواروں سے مل کر رونا اچھا لگتا ہے
ہم بھی پاگل ہو جائیں گے ایسا لگتا ہے

پھر یوں ہوا کہ یہ غزل اُس دَور کے مشہور اور اچھے گلوکار حنیف آگرے والے کے ہاتھ لگ گئی، اس غزل اور طرزِ حنیف نے قیصر الجعفری کے نام کو خوشبو کی طرح پھیلا دِیا۔ قیصر الجعفری معروف تو پہلے بھی تھے مگر بعد میں مشہور اُستاد رئیس خان نے اُن کی یہ غزل گا کر لوگوں کو جیسے پاگل کر دِیا اور پھر اکثر گلوکار 'قیصری غزل' کو گانا ایک سعادت جاننے لگے۔ اُن کی بعض غزلیں تو فلمی گانوں کی طرح مقبول ہوئیں یہاں تک کہ اُن کا کلام سرحد، پار کر گیا اور وہاں بھی گلی کوچوں سے لے کر باوقار محفلوں میں کلامِ قیصری کو خوب خوب پذیرائی ملی۔ اس پذیرائی میں یوں بھی ہوا کہ قیصر الجعفری کا بعض کلام پاکستانی شعرا کے نام سے مشہور ہو گیا۔

ایک اطلاع یہ بھی گوش گزار ہو کہ سرحد اُس پار ایک شاعر قیصر جعفری بھی ہیں اور سرحد کے اِس پار کے قیصر الجعفری سے تو ہم آپ واقف ہیں ہی۔ اب خبر ملاحظہ کیجیے، یہاں مدراس (چنئی) میں ایک مشہور ادیب و شاعر گزرے ہیں جنھوں نے پاکستانی شاعری اور شاعروں کا ایک تذکرہ کتابی شکل میں پیش کیا، تو اُس میں پاکستان کے قیصر جعفری کا بھی ذکر تھا یقیناً اُن کا

تذکرہ ہونا بھی چاہیے تھا مگر مدراس والے شاعر و ادیب کی بے خبری پر ہم حیران رہ گئے کہ قیصر جعفری (پاکستانی) کے تذکرے میں ہندستانی قیصر الجعفری کے بعض مشہور شعر درج کیے گئے تھے۔ ہم نے اپنے آپ کو یہ مصرع پڑھ کر بہلا لیا:

'اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں'

قیصر الجعفری کے کئی شعر سرحد اِس پار سے اُس پار تک یکساں مقبول ہیں۔ یہ تو رہی اُن کے کلام کی عوامی شہرت یا مقبولیت کا قصہ مگر اس کے برعکس انہیں ادب کے خواص میں بھی داد وتحسین ملی۔ ان کی شاعری میں اگر تغزل کا رنگ گہرا تا ہے تو وہیں زندگی کے مسائل نے بھی شعری پیکر اختیار کیا ہے۔ اس کی ایک دو مثال نہیں ہیں بلکہ پوری پوری غزلیں اس کی شاہد ہیں:

دُنیا کے ساتھ حاشیہ آرائیوں میں تھا
مَیں گھر جلا کے خود بھی تماشائیوں میں تھا
یاروں کو کیا ملا مِرا چہرہ کرید کر
جو زخم تھا وہ روح کی گہرائیوں میں تھا
اندھے کنویں میں ڈال کے مجھ کو چلا گیا
وہ بے وفا لہو جو مرے بھائیوں میں تھا

یہ پوری غزل آج بھی باذوق لوگوں کو ازبر ہے۔

ایک صاحبِ دل کا بہت ہی اِجمالی فقرہ 'قیصری شاعری' پر دال ہے:

''قیصر الجعفری کے کلام پر تبصرہ نہیں کیا جاسکتا، اسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔''

جس طرح گلزار نے ایک فلمی نغمے میں لکھا تھا:

'ہم نے دیکھی ہے اُن آنکھوں کی مہکتی خوشبو
ہاتھ سے چھُو کے اسے رشتوں کا الزام نہ دو
صرف احساس ہے یہ، روح سے محسوس کرو
پیار کو پیار ہی رہنے دو کوئی نام نہ دو'

قیصر مرحوم کے ہاں ایک شعری وفور تھا جسے کسبی یا مشقی کہنا زیادتی ہوگا۔

ایک مدت سے قیصر الجعفری کی غزلوں / نظموں کے مجموعے بازار میں نہیں ملتے، بہت خوشی کی بات ہے کہ اب قیصر الجعفری کے جاذبِ نظر کلیات کی اشاعت عمل میں آ گئی ہے۔ مگر 'کلیات' کتاب کا نام تو ضرور ہے مگر یہ کلیات ہے نہیں، وہ یوں کہ اس میں اُن کا وہ کلام جس میں انہوں نے سیرتِ رسول ﷺ کو نظم کا جامہ دینے کی شاعرانہ سعیٔ بلیغ بلکہ سچ ہے کہ کامیاب کوشش کی ہے، وہ طویل منظومہ تو اس میں ہے ہی نہیں، ہمارا خیال ہے کہ اگر وہ کلام اس میں شامل ہو جاتا تو یہ کلیات اپنی معنویت ہی میں کامل نہیں ہوتا بلکہ ایک تقدیس بھی اسے نصیب ہوجاتی۔ یہ بات ہم لکھ تو گئے مگر کتاب کی ضخامت بڑھ کر کوئی سات سَو صفحات ہو جاتی، غالباً اسی سبب وہ کلام اس کتاب میں شامل نہیں کیا گیا، جو لوگ نہیں جانتے اُن کے لیے عرض ہے کہ مذکورہ کلام 'چراغِ حرا' کے نام سے دوبار (پہلی اشاعت ادارۂ ادب اسلامی، دہلی کے زیرِ اہتمام 1997 میں) منظرِ عام پر آئی اور پھر اس کا دوسرا اور جاذب نظر ایڈیشن 2012 میں شائع ہوا۔

پیشِ نظر کلیات اپنے آپ میں حسنِ کلام اور صوری حسن کا ایک اچھوتا نمونہ ہے ایسی کتابیں ہماری نظر سے کم گزری ہیں جو اپنے حُسنِ متن اور خوب صورتی میں متوازن ہوں۔ اس کلیات میں قیصر الجعفری کے اِجمالی سوانحی کوائف بھی درج ہیں، جس میں قیصر مرحوم کے شخصی اور زندگی کے کئی گوشے روشن ہو گئے ہیں۔ قیصر مرحوم پر ایم فل بھی کی گئی اور 'جامعہ ممبئی' سے اُن کے فن و شخصیت پر تحقیقی مقالہ بھی لکھا گیا جس پر مذکورہ بمبئی یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی سند بھی دی۔

کلیاتِ قیصر میں ان کی نظمیں بھی ہمیں متوجہ کرتی ہیں۔ دراصل قیصر مرحوم اپنے وقت کے ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ اُن کے لیے اس میدان میں کوئی عمل مشکل نہیں تھا مگر شاعر کا کُل کلام اعلیٰ درجے کا ہو، یہ بھی کوئی کلیہ نہیں ہے، معیار ہی مقدار پر افضل رہا ہے اور استثنا سے قطع نظر کوئی بھی کلیات اس کلیئے کی نفی نہیں کرسکا۔

اُردو کے شعری ادب میں میر تقی میر جنہیں خدائے سخن کہا گیا، اُن کے چھ یا سات دیوان کی خبر ہے مگر دِلّی کے نوشہ میاں کا ایک ہی دیوان ہے۔ کسی نقاد نے لکھا تھا کہ میؔر پر مرؔزا اپنی ہوشیاری (اس لفظ کے مثبت معنی لیے جائیں جو 'ہوش' سے مراد ہیں) کے سبب 'غالب' آ گئے۔ وہ یوں کہ شاعری کے کسی بھی قاری سے اگر آپ سوال کریں کہ میؔر کے تو چھ یا سات دیوان

تھے، وہ اِثبات میں جواب دے گا مگر اُس سے یہ پوچھا جائے کہ مرزا اسداللہ غالب کے کتنے دیوان۔۔۔؟ تو فوری جواب ملے گا کہ 'مرزا کا تو ایک ہی دیوان ہے' اور سب نے پڑھ رکھا ہے مگر چھ یا سات دیوان والے 'میر جی' کو خدائے سخن کا لقب تو نصیب ہوا مگر اُن کے چھ/ سات دیوان کا قاری بہ تلاشِ بسیار خال ہی خال ملے گا اور اس دَور میں۔۔۔!!

مگر دیوانِ غالب کے قاری اور اس کے شارح بھی ایک دو نہیں ہر دَور میں کئی مل جائیں گے۔ میر کی عظمت اپنی جگہ مُسَلّم ہے، عظمتِ میری سے انکار ایک طرح کے کفر سے تعبیر کیا جائے گا مگر مرزا کی ہوش یاری میر جی سے سبقت لے گئی کہ اس نے اپنے کثیر کلام میں سے انتخاب کو ترجیح دِی، ورنہ سوچنے کی بات ہے کہ دیوانِ غالب میں کئی ردیفوں کی غزلیں ایسی ہیں کہ جو مطلع ہی سے عاری نہیں بلکہ انہیں ایک دو ہی شعر پر ٹرخا دِیا گیا ہے، مثلاً:

پِینَس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

ایک نوجوان کے اس سوال نے ہمیں تو لاجواب کر دیا تھا کہ ''ندیم صاحب! بتائیے کہ غالب کی اس شعر والی غزل کا مطلع کیا ہے اور اس زمین میں غالب نے قافیہ 'کہاروں' باندھا ہے یا 'بدلنے'۔۔۔؟''

سچ یہ ہے معتبر دیوانِ غالب میں یہی ایک شعر درج ہے۔ اس طرح کی اور بھی کئی مثالیں نوشہ کے ہاں مل جائیں گی مثلاً:

اُگ رہا ہے دَر و دِیوار سے سبزہ غالب!
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

کوئی کہہ سکتا ہے کہ کیا مرزا اِن زمینوں میں مزید شعر موزوں کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے؟

یقیناً اہلِ نظر کے سامنے یہ سوال ہی مہمل قرار پائے گا۔ دراصل مرزا نے اپنے کُل کلام سے انتخاب کو ترجیح دِی اُن کی اُردو شاعری کا انتخاب جو چند سَو صفحات پر مشتمل ہے، ایک شاہکار ثابت ہوا، معمولی سی ضخامت کا حامل یہ دیوان ہر دَور میں خوبصورت، دیدہ زیب ایڈیشن کی شکل میں شائع ہوتا رہا ہے اور ہماری زبان کی شاعری میں مرزا ہی ایک ایسے شاعر ہیں جن کی مقبولیت کبھی مدھم نہیں ہوئی (یہاں 'مقبولیت' کے وہ معنیٰ نہ لیے جائیں جسے 'پاپولر لٹریچر' کہا جاتا ہے)۔ دیوانِ غالب کی شرح بھی ہر دَور میں شائع ہوتی رہی ہیں، مختصر یہ کہ 'کلیاتِ غالب' تو نہیں چھپا مگر دو تین سَو صفحات کا 'دیوانِ غالب' ہمالیہ کی مانند ہر دَور میں لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتا رہا ہے۔

جس نکتے کی جانب ہم نے اشارہ کیا ہے اس کا مطلب میر جی کی 'میریت' سے یا کسی دوسرے شاعر کی بڑائی سے انکار ہرگز نہیں مگر 'انتخاب' کی جو مثال مرزا نے پیش کی وہ اپنی جگہ اٹل ہے، کیونکہ ہم انتخاب کریں نہ کریں مگر وقت بڑا ظالم ہے وہ جب انتخاب کرتا ہے تو اکثر اوقات ہمارا کُل ایک جُز ہی ثابت ہوتا ہے۔

بہرحال یہ بحث بے معنیٰ ہے یا اس پر ہمیں توجہ مبذول کرنا چاہیے، یہ سوال تو بہرحال باقی ہے۔

اس نکتے کے باوجود 'کلیاتِ قیصر' کے محاسن پر ہمیں اصرار ہے کہ فی زمانہ ایسے محاسن، کلیات تو کجا شعری مجموعوں میں بھی نظر نہیں آتے، البتہ ہمیں اپنی کم نظَری کا اعتراف ہے۔

اُمید نہیں یقین ہے کہ شاعری کے باذوق قارئین 'کلیاتِ قیصر' کے متنِ حسن سے حظ اٹھائیں گے کہ جو اِس کلیات کا وصفِ خاص ہے اور اس خوبصورت کتاب سے اپنی لائبریری کی رونق بڑھائیں گے۔

☆مبصر سے رابطہ: 9323786610 (ممبرا، ممبئ)

❑❑❑

غبار

شاعر: فہمی بدایونی

صفحات: 215، قیمت:-/349، اشاعت: 2024
ISBN 978-81-977447-8-5
ناشر: ریختہ پبلی کیشنز، B-37، سیکٹر-1، نوئیڈا-201301 (یوپی)

——— از: سعید اختر اعظمی☆

'سہل ممتنع' وہ شعر ہوتا ہے جس کے کسی بھی مصرع کی نثر نہ کی جا سکے۔ یعنی اس کی نحوی ترتیب بالکل نثر جیسی ہو۔ یہ شعر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی کہہ لے، مگر کہنے پہ آئے تو کہہ نہ سکے۔ گویا کہ یہ شعری عمل کا ماہرانہ استعمال ہے۔ اس کا بہترین

حوالہ مومن خان مومن کا مشہور زمانہ شعر 'تم مرے پاس ہوتے ہو گویا☆ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا' ہے جس پر مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب نے کہا تھا 'تم میرا نصف دیوان لے لو اور یہ شعر مجھے دے دو'۔ یہ بحث تحقیق طلب ہے کہ یہ واقعہ درست ہے یا نہیں، اس سے قطع نظر سہل ممتنع کی قدر و قیمت کا اندازہ ہمیں بخوبی ہو جاتا ہے۔ مختلف شعرا نے جزوی یا کلّی طور پر اس کے تجربے کیے ہیں جو کافی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ اس میں بالخصوص 'صنعت تضاد' کی تکنیک کو خوبصورتی سے برتا جاتا ہے۔ فہمی بدایونی کی مکمل شاعری اسی سہل ممتنع سے عبارت ہے جس میں موضوعات کے تنوع نے اسے کثیر جہت بنا دیا ہے۔

فہمی بدایونی (زماں شیر خاں پٹن۔ ولادت: 4 جنوری 1952، وفات: 20 اکتوبر 2024) کے آبا و اجداد 1740 میں افغانستان سے روہیل کھنڈ آئے تھے اور مغلیہ فوج کے سپہ سالار روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ انہیں کفالت کے لیے گنگا کنارے کا گاؤں 'سیسونا' دیا گیا تھا۔ 1940 میں سیلاب کی تباہی کے بعد ان کے دادا نے بسولی ضلع بدایوں میں والد کے ننہال میں قیام کیا۔ یہیں ملک شیر خاں عرف مُدّن خاں کے یہاں ان کی ولادت ہوئی۔ سرکاری پرائمری اسکول پاس کرنے کے بعد ان کا داخلہ 1964 میں مدن لال انٹر کالج میں ہوا۔ 1966 میں ہائی اسکول کی تعلیم کے دوران لائبریری سے کرائے پر ابن صفی کے ناول اور شعرا کے دیوان پڑھ کر شاعری کی جانب راغب ہوئے۔ محلہ حویلی سادات کے ہفتہ وار محافل کے طرحی مشاعروں نے سونے پہ سہاگہ کا کام کیا۔ ہم عمر کیفی سنبھلی کی سنائی گئی شاعری ان کے لیے راہ نما بنی۔ نعت گو چچا عثمان خاں کو کلام دکھانے کے ساتھ ماہانہ ادبی نشست منعقد کر کے اصلاح سخن بھی کرتے رہے۔

کوچنگ سینٹر بند کرنے کے بعد ان کے بیٹوں نے 2012 میں فیس بک آئی ڈی 'پی کے فہمی' کے نام سے بنائی جسے بعد میں فہمی بدایونی کر دیا گیا۔ یہاں ہر طرف جون ایلیا کی شاعری کا چرچا تھا۔ انہوں نے بھی فیس بک، انسٹا گرام، ٹویٹر اور ٹک ٹاک پر اپنے اشعار پوسٹ کرنے کا سلسلہ شروع کیا جس کی مقبولیت سے انہیں مشاعروں کے آفر ملنے لگے۔ انہوں نے ابن صفی کے ناولوں کا تجسس اور امیر خسرو کی 'کہہ مکرنی' کا رنگ محاورے کے خصوصی استعمال کے توسط سے اپنی شاعری میں پیش کیا۔ ان کا ادبی سفر نصف صدی (1966 تا 2024) سے زائد عرصے پہ محیط ہے جس میں تین مجموعے (پانچویں سمت، دستکیں نگاہوں کی، ہجر کی دوسری دوا) منظر پر آئے۔ زیر نظر مجموعہ 'غبار' ان کے تینوں مجموعوں کے انتخاب اور چند تازہ غزلوں پہ مشتمل ہے۔

'غبار' کے ابتدائی صفحات میں فرحت احساس کی تحریر 'تری خالی جگہ کو بھر رہے ہیں' اور فہمی بدایونی کے 'کچھ اپنے بارے میں' سے صاحب سخن کے فکر و فن کے دریچے کھلتے ہیں۔ بعد ازاں 117 غزلوں اور تقریباً سات درجن اشعار کو 'متفرقات' کے تحت رکھا گیا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں بالعموم 'تذکرۂ من و تو' کیا ہے جبکہ بعض دوسرے موضوعات بھی ضمناً آ گئے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے حوالے سے کہتے ہیں:

بیل بوٹے خیال میں رکھنا
سادگی بول چال میں رکھنا

....

کسی بھی آگ سے بے خوف کھیل سکتا ہوں
مری غزل میں کرائے کا مال تھوڑی ہے

....

شاعری خون دل سے ہوتی ہے
مفت میں یہ ہنر نہیں آتا

....

مجھ کو آیا نہ ہاتھ پھیلانا
میرے حصے میں شاعری آئی

....

ہم بتاتے ہیں مسئلہ کیا ہے
لوگ کہتے ہیں شعر اچھا ہے

....

شاعری درد زندگی کے بغیر
جیسے اُمّت کوئی نبی کے بغیر

میؔر و غالبؔ سے انہیں دیرینہ عقیدت رہی ہے جسے گاہے گاہے اپنے اشعار میں معتبر کرنے کی سعی کی ہے۔ بطور نمونہ:

میؔر و غالبؔ کے زیرنگرانی
عشق پہ کام چل رہا ہے ابھی

....

کیا نہیں ہوتا مفلسی میں دیکھ
میؔر و غالبؔ کی شاعری میں دیکھ

....

ابھی چمکے نہیں غالبؔ کے جوتے
کئی نقاد پالش کر رہے ہیں

'صنعت تضاد' کو برتنے میں انہوں نے بعض الفاظ کو مکرر رکھا ہے تو کہیں کہیں' چاند، بڑھیا، روزہ ،عید وغیرہ' کے روایتی موضوع کو'سوچ رنگ' کا نیا زاویہ فراہم کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

اس کی خوشبو کے ساتھ آتی ہوئی
دوسری خوشبو جانے کس کی تھی

....

میری دیوانگی پہ اک بڑھیا
ہنس پڑی ماہتاب کے اندر

....

ناکام حسرتوں نے جم کر کیا فساد
میں نے بھی شہر دل میں کرفیو لگا دیا

....

اس برس بھی تم نہ آئے عید ملنے کے لیے
شام تک بیٹھے رہے ہم روزہ داروں کی طرح

....

دھواں، چنگاریاں، کہرام، چیخیں
ہوا اخبار ہوتی جارہی ہے

....

نظر انداز مجھ کو کر رہا ہے
اسے کیسے نظر انداز کردوں

....

پہلے لگتا تھا تم ہی دنیا ہو
اب یہ لگتا ہے تم بھی دنیا ہو

....

اس نے روکر کہا خدا حافظ
اور خدا یاد آگیا مجھ کو

....

آنے والے فقط سلام کریں
اس قدر خیریت بھی ٹھیک نہیں

....

اس کو دیکھا تو یہ بھی بھول گئے
ہم اسے دیکھنے ہی آئے تھے

خیال کی ندرت، افکار کی گہرائی ،زبان و بیان کی سلاست اورلفظوں کی سادگی نے ان کے اشعار کو'زباں زد خاص و عام' بنادیا ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

دعائے وصل اکیلی پڑگئی ہے
اُدھر سے ایک دو آمین بھیجو

....

کھنک جیسی صدا ہے دستکوں میں
ہوا کیا چوڑیاں پہنے ہوئے ہے

....

کفایت سے کریں گے خرچ اس کو
کسی نے اک دلاسہ دے دیا ہے

....

آنکھ ہر شخص کو تصویر کا املا بولے
ایک ہی شخص کو اتنا نہیں دیکھا جاتا

....

فکر و مسائل، یاد جاناں
گرم ہوائیں، ٹھنڈا پانی

....

آہٹوں، رت جگوں کے قصوں میں
ذکر دیوار و در نہیں آتا

سطور آخر کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ کیجیے اور فہمی بدایونی کے سہل ممتنع کی داد دیجیے جنہوں نے اس حوالے سے اپنی منفرد شناخت بنائی اور مقبولیت کی معراج تک پہنچے:

اس کے جیسا کوئی ملا ہی نہیں
کیسے ملتا، کہیں پہ تھا ہی نہیں

وہ جہاں تک دکھائی دیتا ہے
اس کے آگے میں دیکھتا ہی نہیں
یاد ہے جو اسی کو یاد کرو
ہجر کی دوسری دوا ہی نہیں
تیرے بارے میں سوچنے والا
اپنے بارے میں سوچتا ہی نہیں

☆مبصر سے رابطہ: ریاض (سعودی عرب) Mob+966598300320

□□□

لہورنگ صحیفہ

شاعر: کہکشاں تبسم

صفحات: 176 (مجلد)، قیمت: -/250، اشاعت: 2020
ناشر: کسوٹی پبلی کیشنز، صدر بازار، سمستی پور-848101 (بہار)
Mobile: 8651449489

——— از: سعید اختر اعظمی☆

'کوئی نظم لکھو/ زمیں کی گھٹن پر/ جو نادان بچوں کے مسکان سی ہو'۔ یہ ایک آزاد نظم کی چند لائنیں ہیں جس کو سمجھنے کے لیے حالات حاضرہ پہ نظر ڈالنی ہوگی۔ اس کا اشارہ ایک دوسری نظم میں یوں کیا گیا ہے۔ 'پھر سے درپیش ہے اک نئی کربلا/ حکم نامہ نیا تو نہیں/ یہ ہے ابن زیادی نوشتہ وہی/ گزری صدیوں کے کھنڈرات سے جو نکل آیا ہے'۔ ایک اور نظم اسی حوالے کو یوں معتبر کرتی ہے۔ 'بساط دیکھو بچھی ہوئی ہے/ اپنے مہروں سے چال چلتے / نہ ہارتے ہیں، نہ جیتتے ہیں/ جو اونچے برگد کی چھاؤں تھامے/ زمیں کو/ اک رزم گاہ بنانے کی کوششوں میں/ جٹے ہوئے ہیں'۔ یہ سارا منظر نامہ سطر در سطر، ورق در ورق خون آلود ہے جسے کہکشاں تبسم نے 'لہورنگ صحیفہ' سے موسوم کیا ہے۔ آزاد ہیئت میں لکھی گئی یہ نظمیں زوال آمیز عہد کا رزمیہ ہیں جسے وہ نوحہ کناں شاعری کے قالب میں ڈھال کر اپنی تخلیقی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو گئی ہیں۔

68 آزاد نظموں اور 30 غزلوں پہ مشتمل 'لہورنگ صحیفہ' کہکشاں تبسم کے احساسات کا بیانیہ ہے۔ آزاد نظموں میں سے اکثر و بیشتر کا موضوع درد و کرب، آہ و فغاں اور ماتم ہے۔ ایک نظم 'کبھی پڑھنا' کی چند سطریں دیکھیے:

کبھی پڑھنا/ در و دیوار پہ لکھی ہوئی تحریر سے آگے/ کسی چہرے پہ اوراق پریشاں کی طرح/ افسردہ آنکھوں کو/ کسی رخسار پہ ٹھہرا ہوا آنسو سمندر بھر/ کبھی پڑھنا/ جو زورِ موج سطح آب پہ تحریر کرتا ہے/ ہوا کا خامہ لکھتا ہے جو نوحہ جلتی دھرتی پر

ایک دوسری نظم 'رقص شرر' کا بیانیہ بھی اسی خوں ریز انقلاب کا پیش خیمہ بن گیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

سوادِ جاں میں خوابیدہ/ ہزاروں آرزوؤں/ خواہشوں کے اَن گنت پیکر/ ہیں جن کے عکس نادیدہ/ کہیں اندر پگھلتا ہے/ بہت گہرائی میں رقص شرر جاری/ کوئی رستہ بنانے کے جنوں میں گم/ کہ لاوا بن کے پھوٹے/ آگ کے دریا سا بہہ نکلے/ چٹانیں موم کے مانند پگھلا دے/ کہ یہ دھرتی بھی اب/ کروٹ بدلنا چاہتی ہے

جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں جبکہ امن کی تلاش میں بے قرار تتلی چمن میں خوشبوؤں کی منتظر ہے مگر یہاں ہر طرف بارود کی کریہہ بُو نے ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ 'سکوت کے اس پار' میں یہی بات کہی گئی ہے:

فضا بارود سے بوجھل/ ہراساں لوگ دونوں سمت / عجب سے وسوسے خدشے/ اور انہونی کا ڈر لرزاں/ وہیں اس پار اور اُس پار کے مابین/ اُگے پودوں کی صف پر/ خوش نما ننھی سی اک تتلی/ تلاش غنچہ و گل میں/ دھنک سا پنکھ پھیلائے/ تھرکتی اُڑ رہی ہے/ خوش بوؤں کے گھونٹ بھرنے کو

جانے کیوں قائدینِ قوم ملک میں امن و امان قائم کرنے سے گریز پائی اختیار کرتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ بدامنی کے سائے میں ہی ان کی سیاست پروان چڑھ سکتی ہے۔ شاعرہ کا دل عہد حاضر کے اس رزمیہ پر درد کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ وہ ہر ایک کے سوز دروں کو اپنے دل کے قریب محسوس کرتی ہے اور یہ اعلان کرتی ہے:

سب کے اپنے خواب ہیں جاناں/ سب کے اپنے قصے/ نفرت، پیار، ہوس اور دھوکا/ سب کی الگ کہانی/ ڈگر سے ہٹ کر کچھ افسانے/ الگ الگ رنگوں میں سجے ہیں/ دکھ کی لہریں

اک جیسی ہیں/ درد کی ٹیسیں اک جیسی ہیں/ اور آنسو یک رنگ

وہ چاہتی ہے کہ اس حبس زدہ ماحول کو ختم کیا جائے، کہیں سے تازہ ہوا کا جھونکا آئے اور فضا خوش گوار ہوجائے۔ وہ ایک حساس قلم کار کی ذمہ داری کو حتی الامکان نبھانے کے لیے کوشاں ہے۔

عجب سا حبس ہے/ کوئی اک پوٹلی تازہ ہوا کی لے کے آئے/ کوئی تیشہ اُٹھاؤ/ سنگِ درتوڑو/ ہوائے سبز کو آنے کا رستہ دو

یہ ادنیٰ سی مساعی کارگر نہیں ہو پا رہی ہے کیونکہ وقت، حالات، موسم کوئی بھی اس کا ساتھ نہیں دے رہا ہے پھر بھی اس کے عزائم بلند ہیں۔

سمندر لکھنا چاہا/ اور قلم ریت سے بھر گیا/ دشت سوچا/ سراب ضدی بچوں کی طرح/ کاغذ پہ پاؤں پٹکنے لگے/ دور وادی کی گہری تاریکیوں میں/ نوک مژہ پہ تھرتھراتے اوس کے قطرے/ سورج نکلنے کی بشارت دے رہے ہیں

امید کا یہی چراغ اسے حالات کی آندھیوں سے بچا کر رکھنا ہے۔ شاید ظلمتِ شب کا پردہ چاک ہوجائے اور امن کی صبح نَو عوام کے روبہ رو ہو:

زمیں بچھائے ہوئے مصلّیٰ/ ہوا کے سجدوں کو گن رہی ہے/ شجر حجر سارے ہاتھ باندھے/ دعاؤں میں گم/ بچھڑ کے شاخوں سے زرد پتّے/ صفیں بنانے کی کوششوں میں

غزلوں میں بھی کہیں کہیں یہ رنگ در آیا ہے۔ یہ شاید حالات حاضرہ کا تقاضا ہے یا پھر رقص جنوں کے سامنے کچھ نہ کر پانے کی بے بسی۔

پھر اے قفس نشینو اُٹھاؤ دعا کو ہاتھ
ہے شاخ شاخ موسمِ وہم و گمان پھر
پہلے خراج مانگ رہا ہے امیرِ وقت
لوٹائے گا وہ شہر میں امن و امان پھر

....

دھماکے، خوف، دہشت، بے پناہی
عذاب شہر کے منظر سلامت
ہوا کی سازشیں بڑھنے لگی ہیں
کہاں دھرتی پہ کوئی گھر سلامت

رنگ دیگراں بھی ان کے یہاں خوب ہے جن میں روایتی موضوعات کو تنوع جہتی عطا کی گئی ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

اندھا یقین ہے تو فقط اس کی ذات پر
جس نے شبِ سیاہ میں جگنو کیا مجھے

....

کبھی تو رنگ مری ذات کا سنور جائے
کوئی تو ہو جو مری سوچ میں اتر جائے
بہت سے حادثے اس رہ گزر سے لپٹے ہیں
سفیر شب سے کہو لوٹ کے وہ گھر جائے

....

کئی شبوں کا یہ تحفہ ہے اپنی آنکھوں میں
شکست خواب کی کچھ کرچیاں سلامت ہیں

....

اک بھرم سا تھا تحفظ ہے گھروں کے درمیاں
کب تھے دروازے سلامت چوکھٹوں کے درمیاں
خواب کا موسم تری جاگیر بن کر رہ گیا
میں نے ساری عمر کاٹی رت جگوں کے درمیاں

سرورق پہ اسم بامسمّی آزاد نظموں کے مجموعے کا نام ہی نہیں، انتساب بھی اسی رنگ کی تصویر ہے۔ 'نئی نسل کی شریانوں میں شعلوں کی انقلابی لپک کے نام'۔ پیش لفظ میں کہکشاں تبسم نے اپنے فکری اظہار کا عندیہ یوں دیا ہے:

''کچھ عرصہ قبل تک کائنات کے جن فطری مظاہر کی دھنک رنگی شعری جمال کا اہم حصہ تھی آج وہ ماحولیاتی المیے کے طور پر پیش کی جارہی ہے۔ نظموں کا کینوس عصری منظرنامہ کو موضوعاتی وسعت اور اسلوبیاتی تنوع کے ساتھ پیش کرنے میں معاون ہے۔ نظموں اور غزلوں پر مشتمل 'لہو رنگ صحیفہ' میرے اندیشوں اور اضطراب کے لمحوں کا زائیدہ ہے کہ شہر گریہ کے مکینوں کے پاس کہنے کے لیے اور ہے ہی کیا۔''

تم کیا جانو کیوں آنکھوں میں بے خوابی کا صحرا ہے
تم کیا جانو جنبش لب پہ کیسا کیسا پہرا ہے
تم کیا جانو شاخ مژہ پہ جگنو کی بارات ہے کیوں
تم کیا جانو زخم جگر کے اندر کتنا گہرا ہے

☆مبصر سے رابطہ: ریاض (سعودی عرب) Mob:+966598300320

□□□

کلیاتِ خیر

[مولانا آزاد کے سینئر معاصر مولانا ابوالخیر رحمانی]

ترتیب وتہذیب: ڈاکٹر افتخار احمد
(Mobile: 9433114692)
صفحات:688، قیمت:-/1000، اشاعت:2024
ISBN 978-93-6062-762-1
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی-2

——— از: ابراہیم افسرؔ

خیر رحمانی بہار کے بھون پٹی جگدیش پور عرف قاضی بہاری میں 12 اکتوبر 1869 کو پیدا ہوئے۔ ان کی وفات 15 نومبر 1948 کو ہوئی۔ انہوں نے دارلعلوم دیوبند سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد متفرق ملازمتیں کیں۔ اسی دوران انہوں نے اخبارات ورسائل میں مضامین سپردِ قلم کیے۔ علم وادب سے انہیں بے حد شغف تھا۔ اس لیے ان کی طبیعت شعر گوئی کی جانب مائل ہوئی۔ انہوں نے داغ دہلوی سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔

زیرِ تبصرہ کتاب 'کلیاتِ خیر' ڈاکٹر افتخار احمد کی برسوں کی محنت، تلاش وجستجو کا نتیجہ ہے۔ فی الوقت ڈاکٹر افتخار احمد مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد کے شعبۂ فارسی میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے 'کلیاتِ خیر' میں 'حسناتِ خیر' (دیوانِ اوّل)، 'لمعاتِ خیر' (دیوانِ دوم)، گلنارِ نظمیں، مسلکِ حاضرہ، جوشِ آزادی، ملہمِ غیب خیر (قطعاتِ تاریخ) سپاس نامۂ ارمانِ خیر، رشحاتِ خیر ونفحاتِ خیر (دیوانِ فارسی، سوم)، رباعیات، ساقی نامہ مفردات وغیرہ کو شامل کیا ہے۔ مرتب نے اپنے پیش لفظ 'اور کچھ بیاں اپنا' میں لکھا کہ مولانا ابوالخیر متخلص بہ خیر رحمانی 19 ویں صدی کے ایک مشہور شاعر اور صحافی تھے۔ لیکن ان کی زندگی میں ان کا کوئی دیوان شائع نہ ہوا۔ حالاں کہ لکھنؤ اور لاہور کے پبلشرز نے اپنی دلچسپی کے لیے خیر رحمانی کی غزلوں کے انتخاب شائع کیے۔ خیر صاحب اخبار 'الپنچ' اور رسالہ 'شوخ' سے بھی وابستہ رہے۔ ڈاکٹر افتخار احمد نے خیر رحمانی کے کچھ مضامین اور اخبارات میں شائع کلام کو بھی زیرِ نظر کتاب میں شامل کیا ہے۔

خیر رحمانی عربی، فارسی اور اُردو کے جید عالم تھے۔ انہوں نے فارسی اور اُردو میں شعر گوئی کی اور کئی انگریزی نظموں کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ خیر رحمانی نے اپنی نظموں میں عالمی سطح کے مسائل کی عکاسی اور ترجمانی بھی کی۔ ان کی مشہور نظم 'لاسین کانفرنس' ہے۔ اس نظم میں انہوں نے پہلی عالمی جنگ کے بعد لیگ آف نیشنز کے ترکی سے کیے گئے عہد و پیماں کو موضوع بنایا ہے۔ دراصل یہ نظم اکبر الہ آبادی کی مشہور نظم 'جلوۂ دربار دہلی' کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ ڈاکٹر افتخار احمد نے اپنے مقدمے میں دونوں نظموں کا موازنہ پیش کیا ہے۔ اس موازنہ میں وہ خود لکھتے ہیں کہ اکبر الہ آبادی کی مشہور نظم 'جلوۂ دربار دہلی' کو ایک طرف اور خیر کی نظم 'لاسین' کو دوسری جانب رکھنے پر یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مواد و مضمون کے لحاظ سے دونوں میں تھوڑی مماثلت ہے۔ دونوں کے یہاں مشترک اقدار کا رونا ہے لیکن خیر کا کینوس بڑا ہے۔ نظم دربار دہلی اور نظم لاسین کانفرنس میں طنز وظرافت کے ساتھ تہذیبی تصادم کو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ (ص 184) خیر رحمانی کی نظم لاسین کانفرنس کا ایک بند ملاحظہ کیجیے جس میں انہوں نے اس کانفرنس میں شامل عالمی رہنماؤں کی شاطرانہ چالوں کو تضحیک کا نشانہ بنایا ہے:

ہم نے بھی لاسین کو دیکھا
بالشونک چچرن کو دیکھا
مجلس میں کرزن کو دیکھا
چالڈ سے برفن کو دیکھا
کانفرنس میں اُلجھن دیکھی
کرزن کی وہ پھسلن دیکھی

خیر رحمانی نے اپنی نظم 'ساقی نامہ' میں تہذیبی تصادم کے علاوہ مشرقی اور مغربی تمدن کے امتیاز کو واضح کیا ہے۔ انہوں نے اس نظم میں جزئیات نگاری اور محاکات کا خوب استعمال کیا ہے۔ علاوہ ازیں ہندی اور انگریزی الفاظ کا بہ خوبی استعمال کیا ہے۔ موسموں کے نشیب و فراز، پرندوں کی آواز، تشبیہات، استعارات، تلمیحات پر بھی اس میں گفتگو کی گئی ہے۔ خیر رحمانی نے اس نظم میں شاعروں کے اسما، شہروں کے حال، اخبارات کا

شکریہ بھی انوکھے انداز میں کیا:

ساقی ہمت نہ پست کرنا
یاروں کو ہے آج مست کرنا
ہے جشنِ جلوس سالِ ثانی
ہے پنچ کی آج میزبانی
گڈ ہیلتھ کا جام 'پنچ' کے ڈھال
سارے دشمن ہوں اس کے پامال

خیر رحمانی نے اپنے لوک گیتوں میں عوامی احساس وجذبات کی سچی ترجمانی کی ہے۔انہوں نے اپنی رباعیوں میں حالاتِ حاضرہ، پندونصائح وغیرہ موضوعات پر تبادلۂ خیال کیا ہے۔شاعر نے روزمرہ کی ضروریات میں شامل چھوٹی چھوٹی اشیا کو بھی شعری پیکر عطا کیا ہے۔ان کی نگاہ میں انسان کی زندگی میں ہر چیز کا اپنا مقام ومرتبہ ہوتا ہے۔خیر رحمانی نے پان کی شان میں جو اشعار کہے وہ قابلِ توجہ ہیں۔اس میں انہوں نے پان کی بناوٹ اور اس کے سرخ ہونے کی وضاحت اس انداز میں کی:

کچھ پان کی حاجت نہیں، ہے اس کا دہن سُرخ
پیدا کیا اللہ نے خود لعلِ یمن سُرخ
دیدار دکھائے گا پھر اللہ کسی دن
آنکھیں نہ کریں غم میں مرے اہلِ وطن سُرخ
لالے کو بھی ہے میری طرح شوقِ شہادت
بے وجہ نہیں پہنے ہوئے ہے وہ کفن سُرخ

ڈاکٹر افتخار احمد نے 'کلیاتِ خیر' کی تدوین وتحقیق میں بڑی جاں فشانی سے کام لیا ہے۔انہوں نے اپنی انتھک محنت اور لگن کے بعد اسے جدید تدوین کے اصولوں کے تحت مرتب کیا ہے۔اپنے مربوط ومبسوط مقدمے میں خیر رحمانی کی حیات ،ادبی کارناموں،تلامذہ،اساتذہ،حسب نسب،ملازمت،اسفار،بیماری، سپاس ناموں،سفارشوں وغیرہ پر افتخار احمد نے تفصیلی گفتگو کی ہے۔فاضل مرتب ومحقق نے 27اخبارات، کتابیات ورسالہ جات کا ذکر کتاب کے آخر میں کیا جن کی مدد سے انہوں نے کلیاتِ خیر کو مرتب کیا۔کتاب پر تقریظ پروفیسر محمد کاظم نے لکھی ہے۔اس تقریظ نما پیش لفظ میں محمد کاظم صاحب نے ڈاکٹر افتخار کی محنتِ شاقہ اور تبحرِ علمی کا بیان واعتراف صدق دل سے کیا ہے۔انہوں نے افتخار صاحب کے بارے میں یہ لکھا کہ جس طرح مرزا غالب کو الطاف حسین حالی جیسا قدر شناس ملا ٹھیک ویسے ہی (مولانا) خیر رحمانی کو بھی افتخار احمد جیسا مداح مل گیا ہے۔اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ خیر رحمانی کا کلام ایک عرصے سے پردۂ خفا میں تھا۔لیکن افتخار صاحب نے اپنی تدریسی وخانگی ذمہ داریوں کے سبب اسے نہ صرف مرتب کیا بلکہ اسے قارئین کے سامنے پیش بھی کیا۔پروفیسر شیخ اشتیاق احمد نے بھی ڈاکٹر افتخار احمد کی اس بیش بہا ادبی کاوش کے بارے میں لکھا کہ (مولانا) خیر رحمانی کی شاعری پر مشتمل چھوٹے چھوٹے مجموعے رسائل کی شکل میں ان کے عہد میں ہی شائع ہوئے لیکن ان کا مکمل دیوان شائع نہ ہو سکا۔ڈاکٹر افتخار احمد نے بڑی جاں فشانی، باریک بینی اور دقت نظری سے خیر رحمانی کے ضخیم کلام کو 'کلیاتِ خیر' کے نام سے نہ صرف مرتب ومدون کیا بلکہ اس پر بسیط مقدمہ لکھا جس سے موصوف کی ژرف نگاہی کا پتا چلتا ہے۔اسی طرح پروفیسر سید عین الحسن (وائس چانسلر،مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی،حیدرآباد) نے بھی ڈاکٹر افتخار احمد اور کلیاتِ خیر کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ (مولانا) خیر رحمانی کے دیوان کے نسخے مخطوطے کی شکل میں تھے۔اُردو میں حسناتِ خیر،لمعاتِ خیر ان کے دو دیوان ہیں۔۔۔ڈاکٹر افتخار احمد نے ان مخطوطات اور مطبوعات کو حاصل کیا اور بڑی دقت نظری سے کلامِ خیر کی تدوین کی ہے۔کتاب کا انتساب عدیلہ خاتون اور صفیہ خاتون عرف چاند بی بی کے نام ہے۔کتاب کی طباعت معیاری اور کاغذ کی کوالٹی اعلیٰ ہے۔امید قوی کہ علمی وادبی حلقوں میں ڈاکٹر افتخار احمد کی اس کاوش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

٭مبصر کا پتہ: وارڈ نمبر 1،مہپا چوراہا،نگر پنچایت سِوال خاص، میرٹھ-250501(یوپی)۔موبائل:9897012528

□□□

عہد وسطیٰ میں ہندوستان کے مسلم حکمراں
مصنف: پرویز اشرفی
ISBN 978-93-83239-93-1
صفحات: 272 قیمت:-/300
رابطہ:اردو بک ریویو،نئی دہلی۔فون:011-44753890

نقشِ ثباتِ دوام

مصنف وناشر: ڈاکٹر محمد نفیس حسن

صفحات: 236، قیمت: -/125، اشاعت: جنوری 2025
ناشر: ڈاکٹر محمد نفیس حسن، 1645 دوسری منزل، کوچہ دکھنی رائے، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-110002

——— از: ڈاکٹر ذکی طارق☆

ڈاکٹر محمد نفیس حسن فصیل بند شہر دہلی سے تعلق رکھتے ہیں۔ طویل مدّت تک درس وتدریس سے وابستہ رہے ہیں۔ بچپن ہی سے مطالعہ کے شوقین رہے جس نے اردو کی زرخیز زمین میں کچھ تخلیقی ہنر دکھانے اور نئی فصل اُگانے کے لیے اکسایا۔ تخلیقِ شعر وادب ایک نعمتِ خداوندی ہے۔ اس میں بھی اللہ پاک نے اُن کی رہنمائی کی۔ برسوں کا تدریسی تجربہ اور مطالعہ کام آیا اور انہوں نے قلم کے جوہر بکھیرنے شروع کردیے۔ اس کا اندازہ ان کی نصف درجن سے زیادہ تخلیقات سے ہوتا ہے۔ انتہائی باوقار اور قابل انسان ہیں۔ مزاج میں سادگی اور خوش اخلاقی اُن کے وہ اوصاف ہیں جو اُن کو عصرِ حاضر کے شاعروں اور ادیبوں سے علاحدہ شناخت کراتے ہیں۔ وہ صرف شاعر یا ادیب ہی نہیں ہیں بلکہ اسلامی علوم پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ آسان اور عام فہم زبان میں اُن کی علمی، ادبی شعری تصانیف سنجیدہ علمی حلقوں میں ذوق وشوق سے پڑھی جاتی رہی ہیں۔

زیر تبصرہ شعری مجموعہ 'نقشِ ثباتِ دوام'، 'نذرانۂ حرم'، 'طرزِ ادا' اور 'آہنگ سوز و ساز' کے بعد شائع ہونے والا چوتھا مجموعہ ہے۔ اس میں موصوف نے 2016 سے دسمبر 2022 تک کا کلام نذرِ قارئین کیا ہے، جو 11 حمد ومناجات، 5 نعت پاک، 292 غزلیات اور 20 نظموں پر مشتمل ہے۔

'نقشِ ثباتِ دوام' کے مطالعہ سے اُن کے مزاج، شخصیت اور فن کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ حمد، مناجات اور نعت پاک سے اُن کی پاکیزہ فکر عقیدے کی پختگی کا احساس ہوتا ہے تو اُن کی غزلوں سے اُن کی زود گوئی اور قادرالکلامی کا پتہ چلتا ہے۔ مطالعہ کی گہرائی، لہجہ کی شائستگی اور مختلف موضوعات کو غزل کے سانچے میں اس طرح ڈھالنا کہ وہ زمانہ کا درد بن جائے، یہ فن نفیس حسن کو بخوبی آتا ہے۔ ان کی غزلیں موضوعات کی رنگارنگی کے سبب قاری کو ایک نئے ذائقہ سے آشنا کراتی ہیں۔ ان کی شاعری ایک طرف اخلاقی، سماجی اور سیاسی اقدار کی پامالی کا اظہاریہ ہے تو دوسری طرف وہ نوجوان نسل کو نصیحت بھی کرنا چاہتے ہیں۔ محبوب کے لمس اور ہجر کی کہانیاں جہاں غزلیہ زبان میں انہوں نے سنائی ہیں وہیں نماز وسجود کا ذکر بھی موجود ہے۔ اسلامی تاریخ کے اہم واقعات کو انہوں نے غزل کی زبان عطا کی ہے۔ ابرہا اور ابابیل کے واقعہ کی تصویر کشی میں تلمیح کا استعمال قابلِ تعریف ہے۔ اس طرح مختلف صنعتیں اُن کے کلام میں جابجا بکھری ہوئی ہیں۔ ان کے یہاں تصوف سے متعلق بھی اشعار موجود ہیں جو انسان دوستی، بلند نظری اور صلح کل کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔ ثقیل قوافی اور ردیفیں جہاں پرانے اساتذہ کی یاد دلاتی ہیں وہیں الفاظ ومحاروں پر ان کی گرفت کی غمازی کرتی ہیں۔ سہلِ ممتنع میں اُن کی غزلیں دلکشی اور تازگی کا خوبصورت نمونہ ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

دوسروں کو بُرا بھلا جو کہے
اُس سے بڑھ کر کوئی بُرا ہی نہیں

....

سفر آساں نہیں ہے زندگی کا
قدم لیکن اٹھانا چاہتا ہوں

....

آپ کی رہ نمائی چاہتا ہوں
تھوڑی سی کج ادائی چاہتا ہوں

....

اب کسی بات کا ملال نہیں
ہم کو مطلب ہے مسکرانے سے

اس مجموعہ میں جو نظمیں شامل ہیں اُن میں ان کے درسی مزاج، دین اسلام سے رغبت، قومی یکجہتی اور محبت کی عکاسی کے ساتھ کورونا جیسی وبا کی روداد محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں جن مناظر کی منظر کشی کی ہے اس کو زندۂ جاوید بنادیا ہے۔ حیرت ہے کہ دہلی جیسے ادبی مرکز میں اُن کو وہ شہرت نہیں ملی جو اُن کا حق ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اُن کا یہ شعری مجموعہ عوام وخواص میں پسند کیا جائے گا۔

☆مبصر کا پتہ: 564 کیلا روڈ، گئوشالہ پھاٹک،
غازی آباد-201009 (یوپی)۔ موبائل: 9818860029

❑❑❑

وفیات Obituaries

تحقیق و ترتیب: محمد عارف اقبال

ڈاکٹر عابد رضا بیدار

(سابق ڈائرکٹر، خدا بخش لائبریری، پٹنہ)

معروف محقق اور خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار کا جمعہ 28 مارچ 2025 کو طویل علالت کے بعد علی گڑھ میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 92 سال تھی۔ مرحوم کا انتقال ان کی بیٹی ڈاکٹر شائستہ بیدار کے گھر (واقع مزمل منزل کمپاؤنڈ، علی گڑھ) پر ہوا جو خود بھی خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کی سابق ڈائرکٹر ہیں۔

عابد رضا بیدار 12 اگست 1933 کو رامپور میں پیدا ہوئے۔ رامپور کے محلّہ کٹرہ جلال الدین خاں میں مقیم منشی حامد رضا خاں ان کے والد تھے۔ ابتدائی تعلیم رامپور میں ہوئی۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اسلامک اسٹڈیز اور اردو میں ماسٹر کی ڈگری لی۔ بی لب (سائنس) کے ساتھ قانون کی ڈگری بھی لی (بشمول مسلم لا)۔ اس کے بعد پروفیسر سیّد مقبول احمد کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ لکھ کر 1959 میں پی ایچ. ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے رضا لائبریری رامپور میں 1959 سے 1964 تک خدمات انجام دیں۔ وہ دہلی کے سپرو ہاؤس کی لائبریری میں ملازم رہے۔ وہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی کے شعبہ ویسٹ ایشین اینڈ نارتھ افریکن اسٹڈیز میں لکچرر بھی رہے۔ 1972 میں وہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے ڈائرکٹر بنائے گئے اور اپنے عہدے پر 1995 تک برقرار رہے۔ عابد رضا بیدار اردو فارسی کے ساتھ عربی، انگریزی، ہندی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ کسی حد تک فرانسیسی زبان بھی جانتے تھے۔ ان کی چالیس سے زیادہ کتابیں شائع ہوئیں اور 200 کے قریب کتابوں کے وہ مرتب رہے۔ انہوں نے دنیا کی کئی بڑی لائبریریز کا مشاہدہ کیا جن میں کیمبرج، اوکسفرڈ، لندن، پیرس، قاہرہ، کراچی، ماسکو اور تہران یونیورسٹی شامل ہیں۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار ایک بیدار مغز اسکالر تھے۔ ان کی فکر سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن اپنے کام کے تئیں وہ صد فی صد ایماندار ہی نہیں بلکہ مشقت پسند تھے۔ لائبریری میں دیگر اسکالر کی رہنمائی بھی کرتے تھے۔ پٹنہ میں ان کے قیام کے دوران میں ایک تنازعہ ان کی کتاب 'سیما کی تلاش' پر شدت اختیار کرگیا تھا۔ وہاں کے کئی مذہبی ادارے بھی مخالف ہوگئے تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ معاملہ منطقی انجام کو پہنچ گیا۔ کیونکہ ان کی شخصیت کا روشن پہلو ہمیشہ علم دوستی اور ادب پروری رہا ہے۔ وہ محقق اور اہل علم سے حکمت کے ساتھ کام لینا جانتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے 23 سالہ دور میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کا معیار عالمی سطح پر پہنچ گیا تھا۔

پروفیسر محسن عثمانی ندوی جن کو ابتدا میں خدا بخش لائبریری کے 'ریڈنگ روم' میں عابد رضا بیدار نے ملازمت دی تھی۔ وہ اپنے مضمون 'مرے قلم کا سفر: منزل بہ منزل' میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر عابد رضا بیدار کو کتاب سے اور کتاب خانہ سے والہانہ محبت تھی، ہر وقت اس کی ترقی اور توسیع کی فکر، وہ خود محنت کرتے تھے اور لائبریری میں کام کرنے والوں کو محنتی اور ایماندار دیکھنا چاہتے تھے۔... انہوں نے لائبریری کو ایک مُردہ خانے یا میوزیم سے ایک زندہ و تابندہ علمی ادارہ سے بدل دیا تھا۔''

یہی وجہ ہے کہ بی بی سی لندن کے رضا عابدی جب خدا بخش لائبریری آئے تو بے ساختہ کہہ اٹھے ''عابد رضا بیدار نے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کو عالمی معیار کا بنا دیا ہے۔''

بیدار صاحب ہی کے دور میں لائبریری کو مکمل طور پر digitalised کیا گیا۔ قیمتی مخطوطے اور دستاویزات کی مائکرو فلم بنانے کا آغاز ہوا اور تکمیل کو پہنچا۔

اپنے مضمون میں پروفیسر محسن عثمانی مزید لکھتے ہیں:

''لیکن شہر میں اور لائبریری میں ایک مافیا تھا جس کا خیال تھا کہ لائبریری شہر عظیم آباد کی لائبریری ہے اور اس شہر میں دانشوروں کی کیا کمی تھی کہ باہر سے ایک شخص کو امپورٹ کر کے یہاں لایا گیا ہے جس نے لوگوں کا سکون سے جینا حرام کر دیا ہے، لیکن شہر کے جو واقعتاً اہل علم و محقق تھے جیسے پروفیسر حسن عسکری اور قاضی عبدالودود وغیرہ وہ سب بیدار صاحب کی

قدر کرتے تھے۔''

پروفیسر عثمانی آگے لکھتے ہیں:

''بیدار صاحب کے علمی ذوق اور لائبریری کے کاموں سے مناسبت اور شغف کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں پورے ملک میں 'معارف' اور 'برہان' اسلامی علوم کے سب سے معیاری مجلے تھے۔ ان دونوں کے مضامین کا اشاریہ انہوں نے تیار کیا تھا۔''

پروفیسر عثمانی یہ بھی لکھتے ہیں:

''خدابخش لائبریری میں ایک روایت ربیع الاول کے مہینہ میں سیرت کا جلسہ منعقد کرنے کی تھی، انہوں نے یہ روایت باقی رکھی اور دہلی سے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کو مقرر کی حیثیت سے بلایا اور کامیاب جلسہ منعقد کیا۔''

عابد رضا بیدار کی شادی 1963 میں معزز جہاں بیگم سے ہوئی تھی، جن کا انتقال 2012 میں ہوا۔ ڈاکٹر شائستہ بیدار انہی کی بیٹی ہیں۔ عابد رضا بیدار کی اردو میں چند علمی و ادبی کتابوں کے نام اس طرح ہیں:

قومی تہذیب اور ہندوستانی مسلمان (کئی حصے)، غالب اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ، نثر کا حسن (میرے عہد کے صاحب طرز نثر نگار)، قائم چاند پوری، اسلامی معاشرے کے تنزل کا اصل سبب (ترجمہ)، یہ شخصیتیں (ترجمہ، امریکہ کے چند سائنس داں)، اودھ پنچ، ادیب، وغیرہ۔ حکیم عبدالحمید (مرحوم) کی خدمات پر بھی ان کی ایک اہم کتاب شائع ہوئی تھی۔

عابد رضا بیدار نے اپنے دور میں خدابخش لائبریری جرنل کا اجرا کیا، جس کے وہ ایڈیٹر تھے۔ اس میں اردو کے ساتھ ہندی اور انگریزی میں تحقیقی و دستاویز مضامین کی شمولیت ہوتی ہے۔ یہ Tri-Lingual مجلہ اب خدابخش لائبریری کے زیر اہتمام پابندی سے شائع ہوتا ہے۔ اس کا ایڈیٹر بحیثیت عہدہ ڈائرکٹر ہوا کرتا ہے۔

عابد رضا بیدار کی تدفین ان کے آبائی شہر رامپور میں ہوئی۔ نماز جنازہ کٹرہ جلال الدین میں ادا کی گئی۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی خدمات صالحہ کو شرف قبولیت بخشے۔ آمین! ♦♦ (محمد عارف اقبال)

پروفیسر خورشید احمد (ماہر اسلامی معاشیات، مفکر، دانشور)

بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہر اسلامی معاشیات، ادیب اور دانشور پروفیسر خورشید احمد اتوار 13 اپریل 2025 کی شب طویل علالت کے بعد یو. کے. لیسٹر (Leicester) میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 93 برس تھی۔ انہوں نے اردو اور انگریزی میں 70 سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ وہ بانی تحریک اسلامی علامہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی (1903—1979) کے دست راست خیال کیے جاتے تھے۔ انہوں نے سیّد مودودی کی تصنیفات کی تدوینِ نو میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ پروفیسر خورشید احمد کا ایک طرہ امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے 'اسلامی معاشیات' کے نظریاتی تصور کو قابل عمل علمی شعبہ کی حیثیت دلوانے میں اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔

پروفیسر خورشید احمد 23 مارچ 1932 کو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ قریشی صدیق خاندان میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نذیر احمد قریشی، علامہ محمد علی جوہر کے دوست تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم دہلی کے اینگلو عربک کالج میں ہوئی۔ تقسیم ہند کے بعد 1947 میں اپنے والدین کے ساتھ وہ لاہور (صوبہ پنجاب) منتقل ہو گئے جبکہ ان کی عمر محض 15 برس تھی۔ 1949 میں ان کا داخلہ لاہور کے گورنمنٹ کالج میں ہوا۔ 17 سال کی عمر میں پروفیسر خورشید احمد کا انگریزی میں پہلا مضمون Muslim Economist میں شائع ہوا جبکہ وہ معاشیات کے طالب علم تھے۔ 1952 میں انہوں نے اول پوزیشن سے بی اے (آنرز) کیا۔ اس کے بعد قانون کی ڈگری بھی لی۔ کراچی یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم ایس سی اور اسلامک اسٹڈیز میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد خورشید احمد کو یونیورسٹی آف لیسٹر (یوکے) سے پی ایچ. ڈی کی ڈگری (68-1967) تفویض کی گئی۔ لیسٹر یونیورسٹی سے 1970 میں ایجوکیشن میں اعزازی ڈاکٹریٹ بھی عطا کی گئی۔ اسی سال یعنی 1970 میں خورشید احمد صاحب لیسٹر یونیورسٹی کے شعبہ فلاسفی میں استاد ہو گئے۔ تاہم اس سے قبل ماہر تعلیم کی حیثیت سے 1955 سے 1958 تک انہوں نے کراچی یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دیں۔

پروفیسر خورشید احمد کا تحریکی سفر 1949 میں ہی شروع ہو گیا تھا، جبکہ وہ 'اسلامی جمعیت طلبا' کے رکن بنے۔ پھر 1953 میں اس تنظیم کے ناظم اعلیٰ منتخب ہوئے۔ 1956 میں وہ جماعت اسلامی سے باضابطہ طور پر منسلک ہو گئے۔ آخر میں جماعت اسلامی کے نائب امیر بھی رہے۔ پروفیسر صاحب نے اسلام، تعلیم، سیاسیات اور معاشیات کے میدانوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان کی اردو اور انگریزی میں 70 سے زائد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

پروفیسر خورشید احمد نے جماعت اسلامی کی نمائندگی کرتے ہوئے 2002 میں پاکستان کے متحدہ مجلس عمل کے پلیٹ فارم سے جنرل الیکشن میں حصہ لیا تھا۔ وہ 2012 تک سینیٹ کے ممبر رہے۔ اس سے قبل پروفیسر خورشید احمد 1978 میں پاکستان کے وفاقی وزیر برائے منصوبہ بندی و ترقی بنائے گئے۔ وہ پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین بھی رہے۔ 1983 سے 1987 تک وہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے بین الاقوامی انسٹی ٹیوٹ آف اکونامکس کے چیئرمین رہے۔ 1979 سے 1983 تک کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی، جدہ کے نائب صدر رہے۔ وہ دو اداروں کے بانی چیئرمین تھے جن میں اول انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز (I.P.S.) اور دوسرا الیسٹر (U.K.) کا اسلامک فاؤنڈیشن۔ اسلامک فاؤنڈیشن (لیسٹر) نے اسلامی معاشیات پر لٹریچر کی اشاعت میں نمایاں کام انجام دیا ہے۔ پروفیسر خورشید احمد کی علمی خدمات کا احاطہ چند صفحات میں ممکن نہیں۔ ان کو 1988 میں پہلا اسلامی ترقیاتی بینک (Islamic Development Bank) ایوارڈ عطا کیا گیا۔ 1990 میں سعودی حکومت کی طرف سے شاہ فیصل بین الاقوامی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

پروفیسر خورشید احمد نے علامہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی فکری نمائندگی کماحقہٗ انجام دی۔ ان کی ترتیب کردہ کتاب 'تحریک اسلامی: ایک تاریخ، ایک داستان' تحریکی حلقے میں معروف ہے۔ ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ یہ کتاب ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور کی فائلوں سے علامہ مودودی کی تحریروں کو جمع کر کے ایک خاص ترتیب سے مرتب کی گئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحریک اسلامی کی تشکیل 1941 میں اچانک نہیں ہوگئی تھی بلکہ دس برس پہلے سے علامہ مودودی اس کے لیے زمین ہموار کر رہے تھے۔ پروفیسر صاحب نے سیّد مودودی کی متعدد کتابوں کی تدوین کی، جن میں 'اسلامی ریاست' خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ پروفیسر خورشید احمد کی کتاب 'اسلام کا نظریۂ حیات' کو بھی بے حد پذیرائی ملی اور سرکاری تعلیم گاہوں کے نصاب میں بھی شامل کی گئی۔ بعد میں اس کتاب کی نظر ثانی کے بعد پروفیسر خورشید احمد نے اسے تین کتابوں کی صورت دے دی۔ یہ تین کتابیں (۱) مذہب اور دور جدید (۲) اسلامی فلسفۂ حیات (۳) اسلامی نظام حیات کے نام سے پہلے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد سے شائع ہوئیں۔ بعد میں بھارت میں مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی سے یہ کتابیں شائع ہوگئیں۔ پروفیسر خورشید احمد کی کتاب 'ادبیاتِ مودودی' میں علامہ مودودی کی ادبی خدمات کو بجا طور سے اجاگر کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف تحریکی رہنما نہیں بلکہ ادب کی دنیا کے بھی شناور تھے۔

پروفیسر خورشید احمد نے اسلامی معاشیات پر جو تحقیقی کام کیا ہے وہ محققین کے لیے بنیادی مآخذ کا درجہ رکھتا ہے۔ انہوں نے سود (ربا) سے پاک اسلامی بینکاری نظام کے عملی پہلوؤں کو اجاگر کرنے اور فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پروفیسر خورشید احمد کا شمار علامہ سیّد مودودی کے اولین اور اہم ترین فکری شاگردوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے علامہ مودودی کے افکار بالخصوص تفہیم القرآن (6 جلدیں) کو انگریزی میں منتقل کر کے عالمی سطح پر متعارف کرایا۔ اس کام میں ظفر اسحاق انصاری (مرحوم) کا خصوصی طور پر اہم کردار رہا ہے۔ سیّد مودودی کے انتقال کے بعد ان کے فکری مشن کو علمی و عملی سطح پر آگے بڑھانے میں پروفیسر خورشید احمد نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

حیدرآباد (دکن) کے احمد ابوسعید صاحب نے فکر مودودی کو آگے بڑھاتے ہوئے ترجمہ قرآن مجید (مع مختصر حواشی) پر ایک علمی کام (ترجمان القرآنِ الکریم) انجام دیا تو پروفیسر خورشید احمد نے اس کام کی بہت تعریف کی۔ احمد ابوسعید صاحب نے 2018 میں لندن کا سفر کیا تھا۔ انہوں نے پروفیسر خورشید احمد کی

معیت میں چند ہفتے گزارے تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ (حیات و خدمات، ماہ و سال کے آئینہ میں) کے لیے 'مقدمہ' تحریر کرنے کی گزارش کی تھی۔ پروفیسر خورشید احمد نے اپنی علالت کے سبب 'مقدمہ' ذرا تاخیر سے ارسال کیا۔ اس مقدمہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ خورشید صاحب کا علامہ مودودیؒ سے کتنا گہرا تعلق تھا۔ اپنے 'مقدمہ' میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''الحمدللہ، میرا 30 برس تک مولانا مودودی سے ایسا تعلق رہا ہے کہ جس میں وہ میرے استاد، قائد، محسن، مربّی کی حیثیت سے قدم قدم پر رہنمائی سے نوازتے رہے ہیں۔ اس مناسبت سے گواہی دیتا ہوں کہ میں نے جس چیز کو مولانا کی زندگی میں فکر وعمل کا سرچشمہ اور روشنی و ہدایت کا منبع پایا ہے، وہ قرآن پاک ہے۔ اسی بنا پر مولانا کی زندگی کی اہم ترین متاع جن چیزوں کو قرار دیا جاسکتا ہے، ان میں سب سے پہلی متاع قرآنِ کریم ہے۔ پھر قرآن کریم ہی کی روشنی میں دین حق کا تصور اور اس کی جامعیت اور تیسری چیز ان دونوں کا تقاضا دعوت، اصلاح اور اقامتِ دین کی منظم جدوجہد۔ یہی وہ تین میدان ہیں جن میں مولانا مودودی نے تاریخ ساز کردار (Contribution) ادا کیا ہے۔'' (صفحہ:45، اشاعت دوم یکم ستمبر 2019)

قاضی حسین احمد صاحب (مرحوم) نے اپنے دورِ امارت میں دسمبر 1996 میں خرم مراد صاحب کے انتقال کے بعد پروفیسر خورشید احمد کو 'ترجمان القرآن' لاہور کا مدیر مقرر کیا تھا۔ نائب مدیر احمد سجاد صاحب کو مقرر کیا گیا۔ جب احمد سجاد صاحب کا انتقال ہوگیا تو سلیم منصور خالد صاحب اس کے نائب مدیر ہوئے۔ سلیم منصور خالد صاحب نے پروفیسر خورشید احمد کے انتقال پر بارہ صفحات پر مشتمل تعزیتی و تاثراتی مضمون لکھا ہے (دیکھیے عالمی ترجمان القرآن، مئی 2025)۔ اپنے مضمون میں سلیم منصور خالد ایک جگہ لکھتے ہیں:

''پروفیسر صاحب کو جتنا بھی قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ جذبے کی گہری آنچ رکھنے کے باوجود، غصے اور جذبات سے کوئی کلمہ ان کی زبان سے نہیں چھلکتا۔ اجتماعی زندگی کے معاملات پر واضح رائے رکھنے کے باوجود کبھی نظم کی حد سے آگے بڑھ کر کوئی بات نہیں کرتے بلکہ نظم اور تحریک کی پالیسی کے دفاع کے لیے بڑے توازن سے پوری قوت لگادیتے ہیں۔ حقیقت میں وہ قائد تھے لیکن ان کے سراپے میں ایک بہترین صابر و شاکر کارکن متحرک تھا۔''

کہا جاتا ہے کہ پروفیسر خورشید احمد کا انتقال اسلام اور علمی دنیا کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ لیکن حیات وموت دونوں کا شمار اللہ کی نعمتوں میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرماکر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام مرحمت فرمائے۔ آمین! ♦♦ (محمد عارف اقبال)

علّامہ غلام محمد وستانوی

(بانی مہتمم جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا)

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا (مہاراشٹر) کے بانی مہتمم اور ماہر تعلیم غلام محمد وستانوی اتوار 4 مئی 2025 کو انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 75 برس تھی۔ غلام محمد وستانوی کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے روایتی اسلامی تعلیم میں عصری مضامین شامل کر کے عملی طور پر تعلیم کے مشن کو آگے بڑھایا۔

غلام محمد وستانوی یکم جون 1950 کو ضلع سورت (گجرات) کے کوساڑی میں پیدا ہوئے۔ 1952 اور 1953 کے درمیان میں ان کا خاندان کوساڑی سے وستان منتقل ہوگیا جو سورت کے منگرولی تعلقہ میں واقعہ ہے۔ اسی نسبت سے غلام محمد (مرحوم) نے اپنے کو وستانوی کہنا شروع کیا۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ قوت الاسلام، کوساڑی میں ہوئی جہاں انہوں نے حفظ قرآن مکمل کیا۔ پھر انہوں نے شمس العلوم، بڑودہ (وڈودرہ) میں تعلیم حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے 1964 میں دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر میں داخلہ لیا۔ 1972 کے اوائل میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ ان کے اساتذہ میں عبداللہ کاپودری اور شیر علی افغانی بھی شامل تھے۔ دورہ حدیث کا ایک سالہ کورس مظاہر العلوم، سہارنپور سے 1973 میں مکمل کیا۔ اس کے بعد انہوں نے عصری تعلیم کی طرف رخ کیا اور MBA کی ڈگری حاصل کی۔ ان کا قریبی اصلاحی تعلق محمد زکریا کاندھلوی سے رہا۔ 1982 میں حضرت کاندھلوی کے انتقال کے بعد علامہ وستانوی

نے سیّد صدیق احمد باندوی سے رجوع کیا۔

علامہ غلام محمد وستانوی نے دارالعلوم کنتھاریہ بھروچ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ 1979 میں انہوں نے اکل کوا (مہاراشٹر) میں اپنا مدرسہ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم کی بنیاد رکھی۔ رفتہ رفتہ دینی اور عصری تعلیم کے امتزاج کی وجہ سے اس ادارے میں ترقی ہوتی گئی۔ اس کے بہتر انتظام کے لیے وہ مستقل طور پر اکل کوا، نندوربار منتقل ہوگئے۔ یہی نہیں وستانوی صاحب نے ملک کے مختلف علاقوں میں بھی متعدد تعلیمی اور فلاحی ادارے قائم کیے۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس اینڈ ریسرچ کے بانی غلام محمد وستانوی نے اعلیٰ ثانوی اسکولوں کے علاوہ B.Ed اور D.Ed (ڈپلوما اِن ایجوکیشن) کے کالجز اور پیشہ ورانہ تربیتی پروگرام کے مراکز قائم کیے۔ انجینئرنگ، فارمیسی اور میڈیکل کالج قائم کیے گئے جو کامیابی سے چل رہے ہیں۔ فارمیسی اور میڈیکل کالج کو میڈیکل کونسل آف انڈیا سے منظوری حاصل ہے۔ علامہ دستانوی نے دیگر پیشہ ورانہ کورسیز مثلاً آئی ٹی آئی، آفس مینجمنٹ، سلائی کڑھائی اور سافٹ ویئر ڈیولپمنٹ جیسے کورسیز کے تربیتی مراکز قائم کیے۔ اس جامع تعلیم کا مقصد دراصل طلبا میں دینی تعلیم کے ساتھ انہیں عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہے تاکہ وہ عملی میدان میں کسی سے کم نہ رہیں اور دین ودنیا کی تفریق مٹ جائے۔

ہندوستان میں علامہ غلام محمد وستانوی کی تعلیمی خدمات جس میں دین ودنیا کی تفریق نہیں، بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ تعلیمی ادارے ہندوستان کے دیگر دینی مدارس کے لیے مثالی نمونے ہیں۔

غلام محمد وستانوی 11 جنوری 2011 کو دارالعلوم دیوبند کے بارہویں مہتمم منتخب ہوئے تھے لیکن دارالعلوم دیوبند میں کچھ اصلاحی اقدامات کے سبب منصب اہتمام سے انہیں مستعفی ہونا پڑا تھا۔ وہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ ان کی اولاد میں سعید وستانوی، حذیفہ وستانوی اور ادریس وستانوی شامل ہیں۔ سعید وستانوی کا 2019 میں انتقال ہوگیا تھا۔ جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا کے بانی کے انتقال کے بعد علامہ غلام محمد وستانوی کے بیٹے حذیفہ وستانوی کو اساتذہ اور ارباب حل وعقد نے اتفاق رائے سے 'رئیس جامعہ' منتخب کیا۔ اس مجلس کا انعقاد جامعہ کی 'مسجد میمنی' میں کیا گیا تھا۔ واضح ہو کہ (مولانا) حذیفہ وستانوی ایک عرصہ سے اپنے مرحوم والد کے معاون رہے تھے اور جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم کے ترجمان کے ایڈیٹر بھی تھے۔ انہوں نے مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی معروف نصابی اردو کتاب (پانچ حصے) کا جدید ایڈیشن اپنی نگرانی میں تیار کرایا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ (مولانا) حذیفہ وستانوی خود اپنے والد محترم کی طرح کس طرح حدود میں رہتے ہوئے روایتی چیزوں کو عصری تقاضے کے مطابق آگے بڑھانے میں نہ صرف دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ مہارت کا ثبوت بھی دیتے ہیں۔ توقع ہے کہ ان کی سرپرستی میں اب جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم کے ادارے بھی اپنے روشن مستقبل کی طرف گامزن رہیں گے۔

اللہ رب العزت علامہ غلام محمد وستانوی کی خدمات کو شرفِ قبولیت بخشے۔ ان کی مغفرت کے ساتھ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین! ◆◆ (محمد عارف اقبال)

پروفیسر شمس الحق عثمانی (ممتاز استاد ومحقق)

اُردو زبان وادب کے ممتاز اسکالر پروفیسر شمس الحق عثمانی طویل علالت کے بعد منگل 22 اپریل 2025 کو انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 77 برس تھی۔ ان کی تدفین بعد نماز مغرب دلی گیٹ کے قبرستان میں ہوئی۔ ان کے پس ماندگان میں بیوہ روشن عثمانی اور ایک بیٹا معین الحق غزالی عثمانی اور ایک بیٹی مشربہ زمرد صبوحی عثمانی شامل ہیں۔

شمس الحق عثمانی 15 فروری 1948 کو دیوبند (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد ابرار الحق عثمانی (1952 میں) بسلسلۂ تلاشِ معاش دیوبند سے دہلی ہجرت کر گئے تھے، اُنہی کے ساتھ چار برس کی عمر سے شمس الحق عثمانی دہلی کے مشہور علاقے بلی ماران کی 'گلی چوکیدار' میں مقیم رہے۔ کئی برس سے وہ صاحبِ فراش تھے اور حال ہی میں انہیں وینٹیلٹر پر رکھا گیا تھا۔

شمس الحق عثمانی نے روایتِ زمانہ کے مطابق ابتدائی تعلیم تو گھر ہی میں حاصل کی اور پھر 1966 میں اینگلو عربک اسکول سے 'ہائر سکنڈری' کی تعلیم کے بعد انہوں نے چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کیں اور گریجویشن کے لیے ذاکر حسین دِلّی کالج سے

رجوع ہوئے اور پھر اسی درس گاہ کی شبینہ کلاسز سے انہوں نے 1976 میں B.A کیا، اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے مرحوم نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لیا، جہاں سے انہوں نے 1978 میں ایم اے ہی مکمل نہیں کیا بلکہ اسی دانش گاہ سے موصوف نے 'راجندر سنگھ بیدی کے 'فن و شخصیت' پر تحقیقی کام کا آغاز کیا۔ 1984 میں اسی جامعہ سے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی۔ جامعہ اسکول سے انہوں نے درس و تدریس کا آغاز کیا۔ انہوں نے 'نوح' (ہریانہ) کے ایک ڈگری کالج میں لکچرر کے طور پر تدریسی خدمات بھی انجام دیں۔ بعد ازاں 1998 میں شمس الحق عثمانی نے اپنی مادرِ علمی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو میں درس دینا شروع کیا اور کوئی پندرہ برس کی علمی و تدریسی خدمات سے وہ 2013 میں سبکدوش ہوئے۔

شمس الحق عثمانی سے ہمیں پروفیسر شمیم حنفی نے ممبئی ہی کے ایک ادبی جلسے میں متعارف کروایا تھا۔ یہ ملاقات سرسری ہی تھی مگر جب عثمانی صاحب نے ہماری کتاب 'پُرسہ' دیکھی اور جس طرح اس کی پذیرائی کی وہ ہمارے لیے ناقابلِ فراموش ہے۔ ان کا اصرار تھا کہ اس کتاب (پُرسہ) کا ایک اشاریہ بھی آئندہ ایڈیشن میں شامل ہونا چاہیے۔ ہماری اس بات کو خودستائی نہ سمجھا جائے، اس ذکر سے محض یہ مطلوب ہے کہ وہ ایک علم دوست ہی نہیں بلکہ چھوٹوں میں فروغِ علمی کا مزاج بھی رکھتے تھے۔

سادہ طبیعت شمس الحق عثمانی ممبئی کے ممتاز اُستاد الیاس شوقی اور مشہور 'منٹو دوست' اسلم پرویز سے بھی قربت رکھتے تھے۔ اُن کا یہ اخلاص ہی تھا کہ وہ الیاس شوقی کی بیٹی کی تقریبِ شادی میں شرکت کے لیے خصوصی طور پر مع اہلیہ ممبئی تشریف لائے، اس موقع پر بھی ہماری ان سے ملاقات ہی نہیں رہی بلکہ کئی ادبی موضوعات پر سیر حاصل گفتگو بھی ہوئی۔ وہ دیکھنے میں تو ایک مولوی لگتے تھے مگر ان کے ہاں کسی قسم کی شدت محسوس نہیں ہوئی۔ 2017 یا 18 کا زمانہ رہا ہوگا جب ہم پرانی دِلّی کے مشہور علاقے بلی ماران میں واقع 'گلی' 'چو کی دار' میں نیا زمندِ عثمانی بنے ہوئے ان کی رہائش پر پہنچے تو وہ نہایت محبت سے ملے۔ انہوں نے 'پُرسہ' کے اشاریے کا پھر ذکر کیا، اپنے چھوٹوں کے کام کے تئیں اُن کی یہ دلچسپی اپنے آپ میں ایک ریکارڈ سے کم نہیں۔ چونکہ وہ خود تحقیق اور تاریخ کے ممتاز اسکالر تھے تو وہ دوسروں کو بھی اسی راہ پر دیکھنے کے متمنی رہے یہ ان کی علم دوستی کی ایک واضح دلیل ہے۔

ان کے ایک شاگرد ثاقب عمران لکھتے ہیں: انہوں (شمس الحق عثمانی) نے ہمیں فکشن کا درس دیا تھا، پریم چند کا 'کفن'۔۔۔ منٹو کا افسانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ، بیدی کی 'لاجونتی' اور ناولٹ ایک چادر میلی سی، قرۃ العین حیدر کا ناول 'آخرِ شب کے ہم سفر' چونکہ ہمارے نصاب میں شامل تھے، انہوں نے جس طرح ان تحریروں کو پڑھایا اور (ہمارے ہاں) فکشن کو سمجھنے کی فہم پیدا کی جوانہی کا حصہ تھی۔

فکشن سے متعلق ان کی تحریریں یقیناً اس کی دلیل ہیں کہ انہوں نے اس موضوع پر کس قدر اخلاص سے عمیق مطالعہ کیا ہوگا۔ عہدِ حاضر میں فکشن جیسے موضوع پر اُن کا مطالعہ اور تفہیم استناد سے کم نہیں۔

ہمارے تدریسی معاشرے میں اس طرح اپنے تلامذہ کی مخلصانہ ذہنی تربیت کرنے والے عنقا ہو رہے ہیں۔ ہمیں یہ اعتراف کرنا ہی چاہیے کہ شمس الحق عثمانی کی رِحلت ہماری تدریسی دُنیا ہی کا نہیں ہم جیسوں کا بھی ایک ذاتی نقصان ہے۔

شمس الحق عثمانی سے آخری ملاقات پر موصوف نے گراں قدر اپنی مرتب کردہ 'نظیر فہمی' کی دونوں جِلدیں بھی عنایت کی تھیں۔ ان کی دیگر کتابوں کے نام ہمیں اس طرح ملے ہیں: بیدی نامہ، محبِ وطن پریم چند اور دیگر مضامین، پیار کی خوشبو، ادب کی تفہیم، دراصل: ادب پاروں کی تفہیم، درحقیقت: تہذیبی افکار اور فن پاروں کی تفہیم باقیات بیدی (غیر مدون تحریریں اور انٹرویوز)، ابوالفضل صدیقی: شخصیت اور فن کی تفہیم، رسالہ جامعہ کی تحریروں کا انتخاب، کلیاتِ منٹو (دو جلدیں)، افسانہ اور شعر کا بلاوہ (تنقید)، غالب اور منٹو اور ان کی وہ کتاب جو اوکسفرڈ پریس نے شائع کی وہ تھی: 'پورا منٹو'۔

'بیدی نامہ' سے متعلق قرۃ العین کا یہ تاثر کسی سند سے کم نہیں:

''یہ مقالہ یقینی طور پر بیدی کے تمام تخلیقی سرمائے کا ایک انتہائی صلاحیت مندانہ اور جامع محاکمہ ہے مقالہ نگار (شمس الحق عثمانی) نے اپنے موضوع کے تمام پہلوؤں اور تمام جہتوں پر

اپنی بصیرت اور گرِفت کی مہریں ثبت کردی ہیں۔''

ان کے عرصۂ صدارتِ شعبۂ اُردو (جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی) میں جو توسیعی خطبات ہوئے وہ بھی ان کی یادگار ہیں (جو اب تک جاری ہیں)۔

'اردو بک ریویو' (اردو کا ایک معروف دستاویزی مجلّہ) نے جب 2008 میں اپنا معروف کالم 'کتاب زندگی' شروع کیا تو (جنوری تا مارچ 2008) کے کالم میں سب سے پہلا نام پروفیسر شمس الحق عثمانی کا تھا۔ اس کالم کے مختصر انٹرویو میں جب پروفیسر شمس الحق عثمانی سے دریافت کیا گیا کہ ''وہ کون سی کتاب ہے جسے آپ بار بار پڑھنا چاہتے ہیں؟'' تو ان کا جواب تھا ''آگ کا دریا''۔ اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ آمین! ◆◆

(ندیم صدیقی، ممبئی)

ڈاکٹر حبیب ملک فلاحی

(مغرب میں فکر اسلامی کے ترجمان)

ملّتِ اسلامیہ کے ایک مایۂ ناز سپوت اور امریکی ریاست فلاڈلفیا میں واقع 'یونیورسٹی آف پنسلوانیا' میں اسلامیات کے سابق پروفیسر ڈاکٹر حبیب ملک فلاحی 75 برس کی عمر میں بدھ 12 مارچ 2025 کو 'پنسلوانیا' کے ایک ہسپتال میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! 13 مارچ کو شام چار بجے پنسلوانیا کے بابا محی الدین مزار نامی قبرستان میں ان کو سپردِ خاک کیا گیا۔

برصغیر کی معروف دینی درسگاہ جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ کے تین اولین فارغ التحصیل فلاحیوں میں شامل ڈاکٹر حبیب ملک 28 دسمبر 1949 کو ریاست اتر پردیش کے ضلع سدھارتھ نگر میں پیدا ہوئے۔ والد گرامی (مولانا) حبیب اللہ قاسمیؒ (متوفیٰ 9 جولائی 1989) اسلامیان ہند کے عظیم رہنما، جماعت اسلامی ہند کے قدیم رکن اور طویل عرصے تک ریاست اتر پردیش کے امیر حلقہ تھے۔

مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اور جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے بعد حبیب ملک فلاحی نے جامعۃ الفلاح سے 1967 میں فضیلت کی سند حاصل کی۔ زمانہ طالب علمی میں ہی اخبارات و رسائل اور بطور خاص سہ روزہ 'دعوت' دہلی میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے تھے۔ چنانچہ 'دعوت' کے مدیر محمد مسلم صاحب نے 18 برس کے اس نوجوان عالم کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور جامعۃ الفلاح سے فراغت کے بعد انہیں دہلی بلا کر اپنی ادارتی ٹیم میں شامل کرلیا۔ خود بیان کرتے ہیں کہ ''جب مسلم صاحب بیمار ہوتے تو میں ان کا اداریہ بھی تحریر کردیا کرتا تھا۔'' سہ روزہ 'دعوت' میں تقریباً 6 ماہ کی صحافتی خدمات کے بعد 1968 میں اعلیٰ تعلیم کے لیے مدینہ منورہ چلے گئے۔

1972 میں 'جامعہ اسلامیہ' مدینہ منورہ سے 'شہادۃ اللیسانس' نامی 4 سالہ گریجویشن کی تکمیل کے بعد سعودی عرب کی 'وزارۃ الاعلام' میں 2 سال بطور صحافی کام کیا۔ اس دوران جریدہ 'عکاظ' اور دیگر عربی اخبارات میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ 1975 میں افریقی ملک نائیجیریا منتقل ہوئے اور وہاں کے معروف شہر زاریا میں واقع احمد بلو یونیورسٹی میں تقریباً ساڑھے سات برس عربی اور اسلامیات کے پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیں۔

1981 میں مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ کا رخ کیا۔ پنسلوانیا یونیورسٹی میں داخلے سے قبل باضابطہ فرنچ اور جرمن زبانیں سیکھیں۔ 'یونیورسٹی آف پنسلوانیا' میں عربک اینڈ اسلامک اسٹڈیز کے شعبے میں M.A کے بعد 'تاریخ الفکر الاسلامی' یا Intellectual History of Islam کے موضوع پر اپنی 'پی ایچ ڈی' مکمل کی۔ 1992 میں حکومتِ امریکہ نے انہیں گرین کارڈ سے نوازا۔

ڈاکٹر حبیب شمالی امریکہ میں 'رابطہ عالم اسلامی' یعنی Muslim World League کے ڈائریکٹر رہے۔ شکاگو، کیلی فورنیا، اور فلاڈلفیا وغیرہ میں رابطہ کی کانفرنسوں اور دیگر پروگراموں میں خطیب اور مترجم کی حیثیت سے ہمیشہ سرگرم رہے۔ انہوں نے متعدد نیشنل اور انٹرنیشنل کانفرنسوں اور سیمیناروں میں علمی مقالات پیش کیے۔ عربی اور انگریزی کے رسائل و جرائد اور اخبارات میں ان کے مضامین کثرت سے شائع ہوئے ہیں۔ تاریخ اسلام نیز عربی زبان و ادب سے متعلق موضوعات پر انہیں خصوصی درک اور عبور حاصل تھا۔

ڈاکٹر حبیب مرحوم کی قابلِ ذکر انگریزی تصنیفات درج ذیل ہیں:

1. The Sharia Rules For Marriage. (Published in 1991)
2. The Quran And The Pursuit of Happiness. (Published in 2015)
3. Forces of Evil .
4. Islam's Theory of Education .

ڈاکٹر حبیب ملک نے اگست 2024 میں The House of Wisdom یعنی 'بیت الحکمۃ' کے نام سے پنسلوانیا میں ایک فلاحی اور رفاہی ادارہ قائم کیا تھا۔ ادارے کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

''اس ادارے کا مقصد مسلمان معاشرے میں علم وحکمت اورتہذیبی قدروں کا فروغ ہے۔ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعے نوجوان طبقے کا روحانی، فکری اور ذہنی ارتقا ہو۔اس کے علاوہ تعلیمی ترقی نیز مکالمہ اور محاضرہ کے ذریعے انسانیت کی خدمت کی جائے''۔

ڈاکٹر حبیب اپنے علاقے کی مسجد الرحمٰن کے مستقل خطیب بھی تھے۔

17 دسمبر 2022 کو ٹیلی فون پر طویل گفتگو کے دوران ان سے مولانا مودودیؒ اور ان کی تحریک کے متعلق سوال کیا گیا تو وہ آب دیدہ ہو گئے اور مولانا سے اپنی ملاقات اور روابط کا ذکر کرتے ہوئے بتایا:

''یہ غالباً 1970 کی بات ہے، مولانا مودودیؒ مدینہ منورہ میں مقیم تھے۔مسجدِ نبوی کے نزدیک غالباً ہوٹل 'فندق تیسیر' میں علما اور طلبا کے درمیان ان کی تقریباً 20 منٹ کی تقریر تھی جس کا میں نے عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ مولانا بہت خوش ہوئے تھے، ان سے میری بالمشافہ بس وہی ایک ملاقات ہے۔ انہوں نے مجھے اپنا مترجم بنانا چاہا اور پاکستان آنے کی دعوت دی، مگر میرے والد صاحب مرحوم کا خیال تھا کہ اگر تم وہاں گئے تو ہم تمہیں کبھی دیکھ نہیں پائیں گے۔ چنانچہ میں نے مولانا سے معذرت کر لی۔ بعد میں ظفر اسحاق انصاری اور مولانا خلیل حامدی وغیرہ کے ذریعے مولانا سے مستقل میرا رابطہ استوار رہا۔ مولانا عربی میں گفتگو مکمل طور پر سمجھتے تھے مگر بولنے کی مشق نہیں تھی، اس لیے مولانا خلیل احمد حامدیؒ کو مترجم کے طور پر ساتھ رکھتے تھے۔''

انجمن طلبا قدیم کے ترجمان ماہ نامہ 'حیاتِ نو' کے ابتدائی شماروں میں شائع ان کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جامعہ کے حالات سے باخبر اور اس کے امور ومعاملات سے آگاہ رہتے تھے، البتہ مادرِ علمی کی زیارت کا موقع تقریباً پچاس برس کے بعد دسمبر 2022 میں ملا۔ 'ہمارے زمانے کی جامعہ' کے موضوع پر طلبا سے خطاب میں انہوں نے اپنا خونِ جگر نکال کر رکھ دیا۔ مادرِ علمی، اساتذہ اور اہلِ بلریا گنج سے ان کی محبت وعقیدت اشک بن کر آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم جامعۃ الفلاح کے نصابِ تعلیم سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ نصاب کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق ازسر نو تشکیل دینا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ درسِ نظامی کو تبدیل کر کے دارالعلوم جامعۃ القاہرہ اور جامعۃ الازہر وغیرہ کی جدید کتابوں کو شامل کیا جانا چاہیے۔ وہ عالمیت اور فضیلت کا نام بھی تبدیل کرنے کے خواہاں تھے۔

گزشتہ برس انہوں نے فلاح کے لیے خصوصی مالی تعاون کے حصول (Fund Raising) کی غرض سے ٹیلی فون پر متعدد صاحبِ حیثیت اور اہلِ خیر حضرات سے رابطہ کیا تھا اور باضابطہ اپیل کی تھی۔

یہ روداد دراصل بے سرو سامانی کے عالم میں ایک دور افتادہ دیہات کی دھول بھری گلیوں سے نکلنے والے اس بچے کی کہانی ہے جو اپنی محنت، لگن، حوصلے اور تنظیمِ اوقات (Time Management) کے سبب ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ایک عظیم الشان تعلیمی مرکز کی پروفیسر شپ تک پہنچا۔ اِس روداد میں اُن ہزاروں دیہی نوجوانوں اور اُن کے سرپرستوں کے لیے پیغام، سبق اور نصیحت ہے جو گاؤں میں ندی کے کنارے بیٹھے جھک مارا کرتے ہیں اور وسائل و ذرائع کی قلت اور جدید معیاری تعلیمی اداروں کے فقدان کو اپنی ناکامیوں اور محرومیوں کے لیے وجہ جواز سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر حبیب (مرحوم) علوم شرقیہ (Oriental Studies) کے ایک بڑے اسکالر تھے۔ ایسی علمی شخصیات انسانی سماج کا

قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں۔مرحوم حبیب ملک فلاحی، سید مودودی کی برپا کردہ 'تحریک اقامت دین' کے گمنام ترجمان تھے۔ ♦♦

(نعمان بدر فلاحی کے طویل مضمون سے ماخوذ)

غازی علم الدین (ممتاز ماہر لسانیات اور استاد)

سرحد پار میرپور (کشمیر) پاکستان سے ملنے والی اطلاع کے مطابق اُردو کے اُستاد اور ماہرِ لسانیات (66 سالہ) غازی علم الدین طویل علالت کے بعد منگل 18 اپریل 2025 کی شب انتقال کر گئے۔

غازی علم الدین لاہور کے مردم خیز سرزمین قصور (برج کلاں) میں یکم جنوری 1959 کو پیدا ہوئے تھے۔اپنے دیار کے گورنمنٹ کالج میں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ہر چند کہ وہ ایک پنجابی خاندان میں پیدا ہوئے تھے مگر وہ اُردو کو اپنی مادری زبان سے کم نہیں سمجھتے تھے۔

اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے انہوں نے 1983 میں فراغت حاصل کی اور درس وتدریس کے شعبے میں ملازمت اختیار کی۔ 35 برس تدریسی خدمات انجام دیں اور پرنسپل جیسے باوقار عہدے سے 2018 میں سبکدوش ہوئے۔لسانی مسائل و موضوعات پر لکھنے کی بنا پر موصوف اُردو دنیا میں معروف ومشہور ہوئے، تحقیق وتنقید سے بھی انہیں خاصا شغف تھا۔زمانہ طالب علمی اور تدریسی دَور میں ادارتی شعبے سے بھی اُن کا تعلق رہا۔ گورنمنٹ ڈگری کالج (افضل پور، میرپور، پاکستان) کی پرنسپل شِپ کے زمانے میں کالج ہٰذا کا چارسَو سے زاید صفحات کا مجلّہ 'سیماب' ان کی مثالی صحافتی پیشکش رہا ہے، جس میں انہوں نے اپنے طلبا کو بھی اس مجلّے کی ادارت میں شامل رکھا۔اس عمل سے چھوٹوں کے تئیں ان کی شفقت اور ان کی تربیت مقصود تھی۔ یہ جریدہ راقم کے بھی مطالعے میں رہ چکا ہے اس کے مشمولات نہایت علمی اور دلچسپ ہوتے تھے۔

ان کی یادگار کتابوں کے نام اس طرح ہیں: میثاقِ عمرانی، لسانی مطالعے، تنقیدی وتجزیاتی زاویے، تخلیقی زاویے، لسانی زاویے اور اُردو کا مقدمہ اور میزانِ انتقادو فکر۔

مرحوم غازی علم الدین پاکستان میں منعقدہ کئی اُردو کانفرنسوں میں تحقیقی مقالے پیش کر چکے ہیں۔موصوف متعدد جامعات (یونیورسٹیز) میں لسانیات پر توسیعی خطبات اور خصوصی لکچر دے چکے ہیں۔ان کے نام مشاہیر زبان وادب کے خطوط کے دو ضخیم مجموعے بھی منظرعام پر آچکے ہیں۔ان مکتوبات کے اکثر موضوعات زبان وقواعد ہیں۔

غازی علم الدین ہندوستان کے علمی ولسانی حلقوں میں بھی معروف رہے ہیں۔ ان کے اکثر مضامین یہاں کے رسائل و جرائد میں بہ اہتمام چھپتے رہے ہیں (جن میں روزنامہ 'ممبئی اُردو نیوز' بھی شامل ہے)۔تدریسی خدمات سے ریٹائرمنٹ کے بعد اُن کی علمی وتحقیقی جستجو ماند نہیں پڑی بلکہ ان موضوعات پر ان کی دلچسپی دوچند ہوگئی۔

غازی علم الدین کی ادب دوستی کی یہ نادرترین مثال اس وقت اپنے قارئین کے گوش گزار کرنا ضروری سمجھتا ہوں ہے کہ جب ڈاکٹر ظ انصاری جیسے ادیب کی نگارشات اُن کی نظر سے گزریں تو انہوں نے ڈاکٹر ظ انصاری سے متعلق میری کتاب 'ظ: ایک شخص تھا' کا مسودہ طلب کیا اور اسے 2020 میں ذاتی طور پر فیصل آباد (پاکستان) کے ممتاز اشاعتی ادارے 'مثال پبلشرز' کے زیر اہتمام نہ صرف شائع کروایا بلکہ پاکستان کے اکثر لکھنے پڑھنے والوں تک پہنچایا بھی۔ یہی نہیں اس سے قبل احقر کی ایک اور کتاب 'پُرسہ' بھی اسی اہتمام سے شائع کی تھی، ان کا یہ اخلاص ناقابلِ فراموش ہے۔

اُردو کے ممتاز ادیب اور پاکستان کے مشہور لسانی اُستاد پروفیسر ڈاکٹر رؤوف پاریکھ اُن کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"غازی علم الدین سے ہم محبت کرتے ہیں کیونکہ یہ اُردو سے محبت کرتے ہیں، ہم دونوں اسی ظالم پہ مرتے ہیں جس کا نام اُردو ہے۔اس لحاظ سے گویا وہ ہمارے حبیب ہی نہیں رقیب بھی ہیں، لیکن اُردو سے محبت ایک ایسا رشتہ ہے کہ جس میں رقیب پر بھی پیار آتا ہے، غازی صاحب جیسے عاشقان اُردو سے دل کو تقویت ہوتی ہے، خدا کرے وہ یوں ہی محبتیں بانٹتے رہیں۔آمین"

غازی علم الدین سے راقم الحروف کے تعلقات کی بنیاد اُن کی کتاب 'لسانی مطالعے' رہی ہے۔ غازی مرحوم دورِ حاضر میں فطری طور پر شرافت اور اخلاقی حسن کا ایک نادر کردار رکھتے

تھے، جس کتاب کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، وہ کتاب نام کی معمولی سی تبدیلی کے ساتھ ایک ہندوستانی شخص نے اپنے نام سے دہلی کے مشہور طباعتی ادارے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کے زیر اہتمام چھپوالی، کوئی دوسرا ہوتا تو اس سرقے پر کیسا ہنگامہ کرتا!، اس کا اندازہ کوئی بھی کرسکتا ہے مگر مرحوم غازی نے اپنی شرافت کا لحاظ رکھا۔ اس معاملے میں حیدرآباد (دکن) کے مشہور شاعر و ادیب ڈاکٹر رؤوف خیر نہ صرف شاہد ہیں بلکہ انہوں نے اس سرقے اور سارق کی خوب خبر لی۔ اس سلسلے میں خیر صاحب کا مضمون نہ صرف ممبئ (میرا روڈ) کے ممتاز جریدے 'اِثبات' کے 'سرقہ نمبر' میں شائع ہوا بلکہ سرحد پار کے جرائد میں بھی چھپ چکا ہے۔

منگل (8 اپریل) کو بعد نمازِ ظہر اُن کے جسدِ خاکی کو سپردِ لحد کیا گیا۔ غازی علم الدین کے پسماندگان میں بیوہ کے ساتھ تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ ان کی ایک بیٹی ڈاکٹر اور بیٹا خبیب غازی انجینئر ہے۔ یہ خبر دیتے ہوئے خبیب میاں نے جملہ مسلمین سے اپنے والد کے حق میں دعائے مغفرت کی درخواست کی ہے۔ ♦♦ (ترتیب و پیشکش: ندیم صدیقی، ممبئ)

پروفیسر نجمہ رحمانی (سابق صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی)

دہلی یونیورسٹی کی سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر نجمہ رحمانی کا سنیچر 22 مارچ 2025 کو صبح ساڑھے نو بجے یونیورسٹی کیمپس کوارٹر میں انتقال ہوگیا۔ وہ گزشتہ ایک برس سے کینسر کے مرض میں مبتلا تھیں۔ ان کی عمر تقریباً 60 سال تھی۔ وہ معروف دانشور اور سیاسی تجزیہ کار ڈاکٹر تسلیم رحمانی کی چھوٹی ہمشیرہ تھیں۔ ان کا جسد خاکی یونیورسٹی کیمپس سے جامعہ نگر مسجد خلیل کے قریب لے جایا گیا۔ نماز جنازہ اور تدفین بھی بعد نماز عصر بٹلہ ہاؤس قبرستان میں ہوئی۔

ڈاکٹر نجمہ رحمانی 25 ستمبر 1965 کو دہلی میں پیدا ہوئیں۔ گریجویشن کے بعد انہوں نے دہلی یونیورسٹی سے 1989 میں ایم اے، 1990 میں ایم فل کے بعد انہوں نے 1995 میں پی ایچ. ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے تدریسی کریئر کا آغاز 1995 ہی میں ذاکر حسین کالج (دہلی یونیورسٹی) میں بحیثیت ایڈہاک لکچرر کے طور پر کیا۔ تقریباً ڈھائی سال (2000 تا 2003) انہوں نے پونے کے نیشنل ڈیفنس اکیڈمی میں بھی ملازمت کی۔ ان کا تقرر 3 فروری 2003 کو دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ہوا۔ اس کے بعد سے اپنے انتقال تک وہ اسی شعبہ سے وابستہ رہیں۔ دریں اثنا ڈاکٹر نجمہ رحمانی فیکلٹی آف آرٹس کی ڈین اور شعبہ اردو کی صدر کے عہدے پر بھی فائز ہوئیں۔ ان کی نگرانی میں پی ایچ. ڈی کے 16 اسکالرز اور ایم فل کے 18 اسکالرز نے تحقیقی مقالات لکھ کر ڈگریاں حاصل کیں۔

ڈاکٹر نجمہ رحمانی ایک نڈر اور بیباک خاتون تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب سے تعلق ہونے کے باوجود انہوں نے تقریباً ڈھائی برس نیشنل ڈیفنس اکیڈمی، پونے میں گزارے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد اپنے طویل مضمون (اردو دنیا، مئی 2025) میں لکھتے ہیں کہ نجمہ رحمانی پونے میں کیڈٹس کی اہم نصابی سرگرمیوں کی انچارج، ڈسپلن کمیٹی کی ممبر اور گولف اسکوارڈن کیڈٹ کونسل کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ حقوق نسواں سے ان کو خاص دلچسپی رہی۔ فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید کی تخلیقات کا گہرا تجربہ کرتے ہوئے ان کی شاعری میں سماجی احتجاج کے عناصر کو اجاگر کیا۔ پروفیسر عقیل مزید لکھتے ہیں:

''پروفیسر نجمہ رحمانی کا علمی سفر محض ایک استاد کا سفر نہیں تھا بلکہ یہ اردو زبان و ادب کے فروغ، تحقیق اور تدریسی نظام میں بہتری کے لیے ایک سنجیدہ کوشش تھی۔''

نجمہ رحمانی کی بے باکی اور غیر معمولی ذہانت کا ذکر کرتے ہوئے سہیل وحید اپنے مضمون (ایوانِ اردو، مئی 2025) میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''زندگی سے بھرپور قہقہے اور بھرپور زندگی کی رمق کا وہ خوبصورت امتزاج تھی۔ وہ دلیری اور دانش مندی کا مجموعہ تھی۔ اس کی عالمانہ حاضر جوابی کا ہر کسی کو قائل ہونا پڑتا تھا۔ آزادی نسواں کی پاسداری اور حقوق نسواں کی پیروکاری میں کسی کے بھی چھکّے چھڑا دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور بے خوفی اور جرأت مندی اس کی شخصیت کا فطری عمل۔''

پروفیسر نجمہ رحمانی کی دو کتابیں آزادی کے بعد اردو شاعرات (1994) اور اردو افسانے کا سفر (2019) ریختہ پر موجود ہیں۔

آخر میں سہیل وحید کے مضمون کا درج ذیل اقتباس دیکھیے:

''نجمہ رحمانی ہونا آسان نہیں ہے۔ نجمہ نے 'زن مبارز' کی طرح زندگی گزاری۔ اس باغیانہ روش میں نجمہ کو شاید اتنا تھکا دیا تھا کہ کینسر سے جنگ لڑنے کی طاقت ہی اس میں نہیں بچ پائی تھی۔ مختلف معرکہ آرائیوں پر منحصر رہی اس کی زندگی، ورنہ کینسر کو شکست دینے کا مادہ بھی اس میں کم موجود نہیں تھا۔'' ◆◆

محمد عارف (اردو دوست، بزنس مین)

فصیل بند شہر دہلی کے میرے ایک مخلص رفیق اور دوست میرے ہم نام محمد عارف جمعہ 28 مارچ 2025 (27 رمضان المبارک 1446 ہجری) کو اچانک اس دارفانی سے رخصت ہوئے۔ ان کی عمر تقریباً 61 برس تھی۔ وہ خواتین سے متعلق روایتی کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ دہلی کے کناٹ پلیس کے قریب شنکر مارکیٹ میں ان کی دکان ہے۔ ان کا آبائی وطن اتر پردیش کا مشہور قصبہ گنگوہ ہے۔

محمد عارف (قلمی نام عارف اقبال) یکم اپریل 1964 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد (حافظ) سعید احمد (مرحوم) نے ایک زمانے میں شنکر مارکیٹ میں دکان کھولی تھی۔ مرحوم کی والدہ (مرحومہ) بھی حافظ قرآن تھیں۔ اپنے والد مرحوم کے قائم کردہ اس دکان کی ترقی میں عارف صاحب نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ ان کا ذہن تخلیقی تھا اور خواتین کی ملبوسات کے نت نئے ڈیزائن تخلیق کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ یہ صلاحیت خداداد تھی اور اس فن میں عارف (مرحوم) کا کوئی استاذ نہیں تھا۔ ذاکر حسین کالج کے گریجویٹ اپنے قلم سے چند منٹوں میں ڈیزائن تخلیق کرکے اپنے کٹر ماسٹر کے حوالے کردیتے تھے۔ ان کے گراہکوں میں اعلیٰ سوسائٹی کی خواتین زیادہ تھیں۔ آنجہانی اٹل بہاری واجپئی کے خاندان کی خواتین بھی انہی کے پاس آتی تھیں۔

محمد عارف کو کتابوں کے مطالعہ کا ذوق تھا۔ کتابیں خرید کر پڑھتے تھے۔ لیکن لکھنے کی طرف مائل کم تھے۔ 'اردو بک ریویو' کے ابتدائی دور میں انہوں نے ایک کتاب 'اسمارٹ ٹیلرنگ بک' (مصنف: بسم اللہ عدیم برہانپوری) کی کتاب پر تبصرہ کیا تھا۔ اردو بک ریویو کے شمارہ اپریل، مئی 1996 میں یہ تبصرہ شائع ہوا تھا۔ وہ اردو زبان و ادب سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ان کی شخصیت انتہائی متواضع اور مزاج میں انکساری تھی۔ شریف النفس انسان تھے۔ دوسروں کے کام آنا ان کا طرہ امتیاز تھا۔ پہلے وہ اپنے پہاڑی بھوجلہ کے مکان میں رہتے تھے۔ گزشتہ پچیس برس قبل انہوں نے لکشمی نگر، رمیش پارک میں اپنا مکان بنوایا تھا۔ پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے سلمان عارف اور حسن عارف شامل ہیں۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ مرحوم کی مغفرت فرما کر ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین! ◆◆

(محمد عارف اقبال)

ڈاکٹر احسن ظفر اللہ (اسلامی اسکالر اور میڈیکل ڈاکٹر)

اسلامی اسکالر، ماہر طب اور جماعت اسلامی ہند کے سابق رکن ڈاکٹر سیّد احسن ظفر اللّٰہ جمعرات 20 مارچ 2025 کو انتقال کرگئے۔ ان کی عمر تقریباً 78 برس تھی۔ وہ ایک شفیق معلم، داعی اور دین اسلام کے سچے خادم تھے، جنہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ سعودی عرب، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا میں گزارا۔ وہاں وہ نہ صرف اپنے پیشہ ورانہ فرائض انجام دیتے رہے بلکہ دعوت دین کو بھی اپنی زندگی کا مرکز و محور بنایا۔ ڈاکٹر احسن ظفر اللہ ولد سیّد شاہ وسیم اللّٰہ کا تعلق ریاست بہار کے معروف قصبہ دِسنہ (نزد بہار شریف) سے تھا، جہاں انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی گزاری۔ علامہ سید سلیمان ندوی سے رشتہ داری تھی۔ ڈاکٹر احسن ظفر اللہ کی پیدائش اگست 1947 میں دِسنہ میں ہوئی تھی۔ انہوں نے پٹنہ کے پی ایم سی ایچ سے ایم بی بی ایس کی ڈگری لی تھی۔ اپنی تعلیم کے دوران میں انہوں نے طلبا اسلامی بہار سے وابستگی کے ذریعہ جماعت اسلامی ہند سے گہرا تعلق قائم کیا۔ انہوں نے اپنے مربی ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ (1918—12 جون 1998) سے زمانہ طالب علمی میں بھرپور استفادہ کیا تھا۔ واضح ہو کہ ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ جماعت اسلامی ہند، حلقہ بہار کے امیر تھے۔ انہوں نے 'حلقہ طلبا اسلامی، بہار' کے نام سے طلبا کی فکری اور دینی تربیت کے لیے اس تنظیم کی بنیاد رکھی تھی۔ ان کے خلوص، ایثار اور دینی وابستگی کی گواہی دینے والے ہزاروں

شاگرداور رفقا آج دنیا بھر میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر احسن ظفر اللہ پیشے کے لحاظ سے اینستھیزیا کے ماہر تھے لیکن ان کی اصل شناخت قرآن سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ وہ حافظ، قاری اور معلم قرآن تھے۔ علاوہ ازیں انہوں نے سینکڑوں احادیث کو عربی متن کے ساتھ حفظ کر رکھا تھا۔ 2011-2012 میں وہ آسٹریلیا منتقل ہوئے اور روٹی ہل میں سکونت اختیار کی۔ یہاں بھی کمزوری اور ضعیفی کے باوجود دین کی خدمت کا سلسلہ جاری رکھا اور مقامی افراد کو قرآن و حدیث کی تعلیم دی۔ بعد ازاں وہ آبرن منتقل ہو گئے جہاں ان کی صحت مزید کمزور ہو گئی اور وہ زیادہ تر بستر تک محدود ہو گئے۔ ان کی نماز جنازہ 21 مارچ کو عمر مسجد، آبرن میں ادا کی گئی جس میں بڑی تعداد میں افراد نے شرکت کی۔ بعد ازاں انہیں رک ووڈ قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ ڈاکٹر احسن ظفر اللہ کی پوری زندگی جماعت اسلامی ہند کے نظریات اور دعوت دین کی عملی تفسیر تھی۔ جماعت اسلامی ہند کے سابق صدر حلقہ (بہار) اور مرکز جماعت اسلامی (ہند) کے سابق سکریٹری جنرل سیّد محمد جعفر، مرحوم کے کلاس فیلو اور طلبا تنظیم کے ساتھی رہے ہیں۔♦♦

پوپ فرانسس (ویٹکن سٹی کے کیتھولک مذہبی سربراہ)

کیتھولک عیسائیوں کے مذہبی پیشوا پوپ فرانسس 88 برس کی عمر میں سوموار 21 اپریل 2025 کو انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 89 برس تھی۔ ان کی موت نے پوری دنیا کے تقریباً 1.4 ارب کیتھولک آبادی کو غم میں غرق کر دیا۔ ایسٹر سنڈے کے موقع پر اپنے آخری عوامی خطاب میں پوپ فرانسس نے اپنے ایک معاون کی جانب سے پڑھے گئے پیغام میں غزہ میں فوری جنگ بندی کے اپنے مطالبے کا اعادہ کیا تھا۔ نمونیا کے باعث پانچ ہفتوں تک ہسپتال میں رہنے سے قبل پوپ فرانسس غزہ میں اسرائیل کی فوجی مہم پر تنقید کرتے رہے تھے۔ انہوں نے گزشتہ جنوری میں فلسطینی علاقے میں انسانی صورت حال کو 'انتہائی سنگین اور شرمناک' قرار دیا تھا۔ ایسٹر کے پیغام میں پوپ نے کہا تھا کہ غزہ کی صورت حال ڈرامائی اور افسوس ناک ہے۔ جارج ماریو برگوگلیو (Jorge Mario Bergoglio) کو 13 مارچ 2013 کو پوپ منتخب کیا گیا تھا۔ وہ کیتھولک چرچ اور ویٹکن سٹی اسٹیٹ کے سربراہ تھے۔ ان کی پیدائش 17 دسمبر 1936 کو ارجنٹینا کے Flores میں ہوئی تھی۔ پوپ فرانسس کے انتقال کی خبر پر وزیر اعظم نریندر مودی نے ان کے ساتھ اپنی کچھ تصویریں سوشل میڈیا پلیٹ فارم 'ایکس' پر شیئر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''پوپ فرانسس کے انتقال سے بہت غمزدہ ہوں۔ غم اور یادوں کے اس لمحہ میں عالمی کیتھولک طبقہ کے تئیں میری گہری ہمدردی۔''

رکن پارلیمنٹ ولوک سبھا میں حزب اختلاف کے قائد راہل گاندھی نے سوشل میڈیا پلیٹ فارم 'ایکس' پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ہمدردی، انصاف اور امن کی عالمی آواز پوپ فرانسس کے انتقال پر گہرا دکھ ہوا ہے۔ وہ پس ماندہ اور حاشیہ پر کھڑے لوگوں کے ساتھ کھڑے رہے، بے خوفی کے ساتھ عدم مساوات کے خلاف آواز اٹھائی اور اپنے پیار و انسانیت کے پیغام سے لاکھوں عقائد کے لوگوں کو متاثر کیا۔ میری ہمدردی ہندوستان اور دنیا بھر میں موجود کیتھولک کمیونٹی کے ساتھ ہے۔''

پوپ فرانسس کے انتقال کے بعد کیتھولک چرچ کے نئے سربراہ کے طور پر کارڈینل رابرٹ پریوسٹ کو منتخب کر لیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے لیے لیو چہاردہم کا نام منتخب کیا ہے۔ رابرٹ پریوسٹ شمالی امریکہ کے ایسے پہلے پوپ ہیں جو کیتھولک چرچ کے دو ہزار سال کی تاریخ میں پہلی بار رہنما منتخب ہوئے ہیں۔ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ اور نائب صدر جے ڈی وینس جنہوں نے 2019 میں کیتھولک مذہب اختیار کر لیا تھا، نئے پوپ کو مبارکباد پیش کی ہے۔♦♦

ڈاکٹر ایم آر سری نواسن (نیوکلیئر سائنس داں)

جوہری سائنس داں اور ایٹمی توانائی کمیشن کے سابق چیئرمین ڈاکٹر ایم آر سری نواسن کا منگل 20 مئی 2025 کو تمل ناڈو کے ادگمنڈلم میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً 95 برس تھی۔ ملک کے سول نیوکلیئر انرجی پروگرام کے چیف آرکیٹیکٹ ڈاکٹر سری نواسن نے ستمبر 1955 میں ڈپارٹمنٹ آف اٹامک

انرجی (ڈی اے ای) میں اپنے کریئر کا آغاز کیا اور پانچ دہائیوں سے زائد عرصے تک خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر ایم آر سری نواسن 5 جنوری 1930 کو بنگلور میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ میکینکل انجینئر اور نیوکلیئر سائنٹسٹ تھے۔ ان کی تعلیم McGill یونیورسٹی اور وسویسّر یا یونیورسٹی کے کالج آف انجینئرنگ میں ہوئی۔

ڈاکٹر ایم آر سری نواسن (Malar Ramasamy Srinivasan) نے ڈاکٹر ہومی جہانگیر بھابھا کے ساتھ ملک کے پہلے نیوکلیئر ریسرچ ری ایکٹر اپسرا کی تعمیر میں حصہ لیا تھا جس نے اگست 1956 میں کام شروع کیا۔ 1959 میں انہیں ملک کے پہلے ایٹمی پاور اسٹیشن کے لیے پروجیکٹ انجینئر مقرر کیا گیا۔ 1947 میں وہ ڈی اے ای کے پاور پروجیکٹ انجینئرنگ ڈویژن کے ڈائرکٹر بنے اور ایک دہائی بعد نیوکلیئر پاور بورڈ کے چیئرمین کا عہدہ سنبھالا۔ 1987 میں ڈاکٹر سری نواسن کو اٹامک انرجی کمیشن کا چیئرمین اور محکمہ جوہری توانائی کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ اسی سال وہ نیوکلیئر پاور کارپوریشن آف انڈیا لمیٹڈ (این پی سی آئی ایل) کے بانی چیئرمین بھی بن گئے۔ ان کے دور میں نمایاں توسیع دیکھنے میں آئی اور ان کی رہنمائی میں 18 نیوکلیئر پاور یونٹ تیار کیے گئے جن میں سے سات کام کر چکے تھے اور سات زیر تعمیر تھے۔ اس کے علاوہ چار منصوبہ بندی کے مرحلے میں تھے۔ ڈاکٹر سری نواسن کو جوہری سائنس اور انجینئرنگ کے شعبے میں ان کی مثالی شراکت کے لیے 2015 میں ملک کے دوسرے اعلیٰ ترین شہری اعزاز پدم وبھوشن سے نوازا گیا۔ ان کی بیٹی شاردا سری نواسن نے خاندان کی جانب سے جاری کردہ ایک بیان میں کہا کہ ان کی وژنری قیادت، تکنیکی مہارت اور قوم کے لیے انتھک خدمات سے آئندہ نسل مستفید ہوتی رہے گی۔ ڈاکٹر سری نواسن کی موت کو ہندوستان کی سائنسی اور تکنیکی تاریخ کے ایک دور کے خاتمے کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے پیچھے ایک پائدار میراث چھوڑی جس نے ملک کی ترقی اور توانائی کی حفاظت کو فروغ دینے میں مدد کی۔ ان کے پس ماندگان میں ایک بیٹی شاردا سری نواسن اور بیٹا رگھوویر سری نواسن شامل ہیں۔ ♦♦

(روزنامہ انقلاب، انڈین ایکسپریس سے ماخوذ)

ڈاکٹر سیّد عباس متقی (طنز و مزاح نگار)

ماہ رمضان المبارک کی اختتامی سحری کے اعلان اور اذان فجر کے ساتھ ہی حیدرآباد کے بین الاقوامی شہرت یافتہ طنز و مزاح نگار اور ادیب و نقاد ڈاکٹر سیّد عباس متقی کی زندگی کا سورج غروب ہو گیا۔ پرنسیس درشہوار چلڈرنس ہسپتال، پرانی حویلی، حیدرآباد میں انہوں نے اتوار 30 مارچ 2025 کو آخری سانس لی۔ ان کی عمر تقریباً 72 سال تھی۔ عالمی سطح پر ممتاز و معروف ڈاکٹر عباس متقی 17 جنوری 1953 کو پیدا ہوئے تھے۔ روزنامہ منصف میں ان کے طنز و مزاح سے بھرپور مضامین ادبی حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ برصغیر ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر بحیثیت مایہ ناز ادیب، شاعر، نقاد اور بہترین کالم نگار کی حیثیت سے انہوں نے اپنی ممتاز و منفرد پہچان بنائی۔ اردو کے علاوہ ان کو فارسی پر عبور تھا۔ طنز و مزاح کی محفلیں ان کے بغیر بے رونق ہوا کرتی تھیں۔ ان کے انتقال پر علماء کرام، مشائخ عظام، شعراء، ادیبوں، صحافیوں اور اساتذہ برادری کی کثیر تعداد نے اظہار رنج و ملال کیا۔ نماز جنازہ بعد نماز عصر مسجد مالن بی صاحبہ (ریتی کی مسجد) یاقوت پورہ میں ادا کی گئی۔ سیّد شاہ مرتضیٰ علی صوفی قادری نے دعائے مغفرت کی۔ سیّد عباس متقی گورنمنٹ بوائز ہائی اسکول مغل پورہ نمبر 3 سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے تھے۔ مقامی مجلس تعمیر ملت مدینہ نگر یاقوت پورہ کے وہ تقریباً 25 سال صدر رہے۔ تعمیر ملت اور مختلف تنظیموں کی جانب سے منعقد ہونے والے عظیم الشان مذہبی و ادبی جلسوں سے انہوں نے خطاب کیا تھا۔

ڈاکٹر سیّد عباس متقی کو اردو اور فارسی کی گراں قدر خدمات اور متعدد کتابوں کی تصنیف پر آندھرا پردیش اردو اکیڈمی اور تلنگانہ اردو اکیڈمی نے متعدد انعامات سے سرفراز کیا۔ انہیں اے پی اردو اکیڈمی کی جانب سے بیسٹ ٹیچر ایوارڈ، کارنامہ حیات ایوارڈ اور مخدوم ایوارڈ بھی عطا کیا گیا تھا۔ ♦♦

(ہفت روزہ گواہ، 11 تا 17 اپریل 2025 سے ماخوذ)

شگفتہ سہسرامی (کہنہ مشق شاعر)

مختار احمد خاں شگفتہ سہسرامی کا منگل 29 اپریل 2025 کو مختصر علالت کے بعد سہسرام کے NMCH میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 78 سال تھی۔ ان کی اہلیہ کا پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ پس ماندگان میں ایک بیٹی اور ایک بیٹا شامل ہیں۔ ان کی تدفین حاجی حرمین قبرستان میں عمل میں آئی۔

کہنہ مشق شاعر مختار احمد خاں شگفتہ سہسرامی شیر شاہ کی نگری سہسرام (بہار) کے کرن سرائے میں 10 فروری 1947 کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالوحید خاں غازی شمسی جید عالم دین تھے۔ شگفتہ سہسرامی نے گریجویشن کے بعد اردو ادب میں ایم اے کی ڈگری لی، پھر درس وتدریس سے وابستہ ہو گئے۔ وہ شیرشاہ انٹر کالج سہسرام (روہتاس) کے صدر مدرس بھی رہے۔ ان کے تین شعری مجموعے منظر عام پر آئے جن میں غزلیات اور قطعات کا مجموعہ 'جستجو' (2008)، نظموں کا مجموعہ 'شانتی' اور نعتیہ کلام کا مجموعہ 'یا صاحب الجمال' شامل ہیں۔ ان کی شخصیت پر ایک کتاب 'شگفتہ سہسرامی: حیات اور ادبی خدمات' بھی منظر عام پر آئی۔ شگفتہ سہسرامی مشاعروں کی دنیا کے بادشاہ اور خوش فکر شاعر خیال کیے جاتے تھے۔ وہ گنگا جمنی تہذیب و ثقافت کی زندہ مثال تھے۔ ادارہ فکر ونظر کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اے کے علوی نے شگفتہ سہسرامی کے انتقال کو اردو شاعری کا عظیم نقصان قرار دیا ہے۔ ♦♦

میر قطب الدین علی چشتی

(بانی و مہتمم جامعہ انوار الہدیٰ، حیدرآباد)

جامعہ انوار الہدیٰ، حیدرآباد کے بانی و مہتمم کا بدھ 2 اپریل 2025 کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 90 برس تھی۔ ان کی نماز جنازہ مسجد جامعہ انوار الہدیٰ میں ادا کی گئی اور جامعہ کے احاطہ ہی میں تدفین عمل میں آئی۔

میر قطب الدین علی چشتی 22 مارچ 1936 کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ 1956 میں انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے بی ایس سی کی تکمیل کی۔ اس کے بعد دارالعلوم دیوبند سے فاضل دینیات ہوئے۔ انہوں نے 1958 میں بھینسہ ہائی اسکول میں فرسٹ اسسٹنٹ ٹیچر کی حیثیت سے تدریسی خدمات کا آغاز کیا۔ پھر ان کا تبادلہ کاغذ نگر میں ہوگیا۔ ان دونوں مقامات سے میر قطب الدین نے دینی تعلیم کی اشاعت کا آغاز کر دیا تھا پھر 1976 میں انہوں نے جامعہ انوار الہدیٰ کی بنیاد رکھی۔ اس کی ایک لائبریری کا نام 'ابوہریرہ لائبریری' ہے۔ میر قطب الدین علی چشتی نے دینی تعلیم کے ساتھ عصری علوم کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبا و طالبات کے لیے ادارے قائم کیے۔ انہوں نے شاہین نگر، حیدرآباد میں انگلش میڈیم کا معیاری اسکول Shine Model School قائم کیا جس میں 1500 طلبا و طالبات زیر تعلیم ہیں۔ اسی طرح Twinkle Star Public School بھی تین سال قبل قائم کیا گیا۔

میر قطب الدین علی چشتی 1958 میں رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئے۔ ان کے بڑے بیٹے حافظ نصیر الدین علی چشتی جامعہ کے معتمد اور داعی اسلام ہیں۔ ان کو سنسکرت اور ہندی زبان میں عبور حاصل ہے۔ دوسرے بیٹے سیّد نظام الدین علی چشتی جامعہ کے مطبخ کے ذمہ دار ہیں۔ تیسرے فرزند سیّد نورالدین علی چشتی فاضل جامعہ ہیں اور حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے ہیں۔ اس وقت وہی جامعہ انوار الہدیٰ کے صدر مدرس اور عصری تعلیم گاہوں کے انچارج ہیں۔ ان کی تین دختران میں دو بیٹیاں جامعہ کے شعبہ نسواں کی ذمہ داری ادا کر رہی ہیں۔ ایک بیٹی شکاگو، امریکہ میں مقیم ہیں اور دینی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ اس طرح میر قطب الدین علی چشتی کے اہل خانہ نے خود کو دینی وعصری تعلیم کے ساتھ تبلیغ دین کی اشاعت کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ ♦♦

(ہفت روزہ گواہ، حیدرآباد۔ ڈاکٹر محمد عبدالرشید کے طویل مضمون سے ماخوذ)

سیّد محمد عاقل (اسلامی اسکالر و محدث)

مظاہر علوم، سہارنپور کے اسلامی اسکالر اور محدث سیّد محمد عاقل اتوار 27 اپریل 2025 کو ظہر سے ذرا قبل انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 88 برس تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے

تلامذہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ وہ تقریباً پچاس برس مظاہر علوم کے صدر مدرس رہے۔ علم حدیث میں موصوف کو کمال حاصل تھا۔

سیّد محمد عاقل 15 اکتوبر 1937 کو پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر میں حفظ قرآن کا آغاز کیا اور 18 اکتوبر 1950 کو حفظ مکمل ہوا۔ جنوری 1961 میں دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد ایک سال میں فنون کی تکمیل کی۔ بخاری شریف شیخ محمد زکریا سے، مسلم شریف منظور احمد خاں سے، ابوداؤد اسعد اللہ سے اور ترمذی و نسائی امیر احمد کاندھلوی سے پڑھی۔ دسمبر 1961 میں مظاہر علوم کے استاد مقرر ہو گئے تھے۔ 1967 میں ان کو مظاہر علوم کا باقاعدہ استاذِ حدیث مقرر کیا گیا۔ 1971 میں صدر مدرس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ سید محمد عاقل شیخ الحدیث محمد زکریا سے بیعت تھے اور انہی سے اجازت بیعت حاصل تھی۔ علمی کاموں میں حضرت محمد زکریا مہاجر مدنی کی معاونت کرتے تھے۔ وہ خود تصنیف و تالیف کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ فروری 1978 میں انہوں نے ایک کتابچہ بزبان عربی 'تعریف و جیز عن جامعۃ مظاہر علوم' تصنیف کیا۔ حضرت گنگوہی کے درس مسلم کے افادات جو حضرت شیخ کے پاس جمع تھے، سیّد محمد عاقل نے حواشی لگائے۔ یہ کتاب اشاعت کے وقت 644 صفحات پر مشتمل تھی۔

شیخ الحدیث سید محمد عاقل نے اپنے بزرگوں سے جو تربیت حاصل کی تھی اس کے نتیجے میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ امت کا ایک بڑا طبقہ جو عاملوں کی چوکھٹ و آستانہ پر سجدہ ریز ہو رہا تھا اور تعویزوں پر حد سے زیادہ اعتماد کر رہا تھا، انہوں نے اس طبقہ کے لیے ایک پُراثر کتاب 'بیان الدعاءٗ' تیار کی۔ اس کتاب کے ذریعے ہزاروں افراد اللہ جل و شانہٗ کے دربار عالی سے وابستہ ہو گئے۔ وہ ایک کامیاب مدرس ہونے کے ساتھ ایک ماہر محقق و مصنف بھی تھے۔ انہوں نے ہر فن کی کتاب کا درس دیا اور اردو عربی میں وہ کتابیں تصنیف کیں جو عوام اور علما کی ضرورت بن گئیں۔ سیّد محمد عاقل کے پس ماندگان میں 6 لڑکیاں اور 6 لڑکے محمد جعفر، محمد عمیر، محمد عادل، محمد عاصم، محمد ثانی اور محمد قاسم شامل ہیں۔ اللہ رب العزت ان کی مغفرت فرما کر ان کے حسنات کو شرف قبولیت بخشے۔ آمین! ♦♦

(عبداللہ خالد قاسمی خیرآبادی اور مفتی بشیر احمد کے مضامین سے ماخوذ)

وجے ارون (شاعر)

اردو کی گنگا جمنی تہذیب کے وارث، ذوق، داغ، جوش ملسیانی اور کالی داس گپتا رضا کی علمی و ادبی قدروں کے امین وجے کمار پوری عرف وجے ارون کا بدھ 21 مئی 2025 کی صبح ممبئی میں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا۔ ان کی آخری رسوم مار وے روڈ ہندو شمشان بھومی (ملاڈ) میں دوپہر ایک بجے ادا کی گئیں۔ ان کی عمر تقریباً 89 سال تھی۔ ان کے پس ماندگان میں بیٹا، بہو اور ایک پوتا شامل ہیں۔

وجے ارون کا خاندانی نام وجے کمار پوری تھا مگر انہوں نے وجے ارون کے قلمی نام سے شہرت پائی۔ وہ ماہر غالبیات کالی داس گپتا رضا کے شاگرد رہے، لہٰذا زبان کی نزاکت و نفاست سے واقف تھے۔ انہوں نے غزلوں کے علاوہ قطعات، رباعیات، گیت، دوہے، منقبت اور سلام بھی لکھے۔

معروف شاعر ساگر ترپاٹھی نے وجے ارون کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''وہ چند ایسے لوگوں میں سے تھے جو پنجاب میں پیدا ہوئے اور اردو کے اچھے شعرا میں شمار کیے گئے۔ وجے ارون نے کئی حمد اور نعتیں کہیں۔ ہندی اور اردو کے حوالے سے جسے صحیح معنوں میں گنگا جمنی تہذیب کہتے ہیں، وہ اس کی عملی تصویر تھے۔ ایک سال قبل ان کے شعری مجموعہ 'غزل مکمل غزل گلاب' کا ممبئی میں اجرا ہوا تھا۔ اس مجموعے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں 50 فیصد غزلیں اردو میں اور 50 فیصد ہندی میں ہیں۔ وہ میر اور غالب کی روایات کے مطابق اشعار کہا کرتے تھے۔ وہ اچھے شاعر کے ساتھ اچھے انسان اور اچھے اناؤنسر بھی تھے۔ وہ شعرا کی اصلاح بھی کیا کرتے تھے۔

شاعر و صحافی ندیم صدیقی کے مطابق ''وجے ارون کا آبائی وطن شہیار پور ہے مگر ان کی جائے پیدائش امرتسر ہے۔ مشہور محقق اور شاعر کالی داس گپتا رضا کے شاگرد ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں بی اے کیا اور ایک مدت کینیا میں رہے۔ دیوناگری میں ان کا شعری مجموعہ 2023 میں شائع ہوا۔ اس میں موصوف نے ہندی شبداولی اور دیومالائی اصطلاحات و کردار کو فنی سلیقے سے برتا ہے۔ ہماری زبان میں اس طرح کے

لکھنے والے اب ناپید ہیں۔ وہ داغ اسکول کے نمائندہ ہی نہیں بلکہ عہد حاضر میں پنجاب سے تعلق رکھنے والے شعرا میں اپنے طرز اپنے ڈھب کے مخلص شاعر تھے۔'' ♦♦

(روزنامہ انقلاب ممبئی، 22 مئی 2025 سے ماخوذ)

مصطفیٰ جمیل بالاپوری (بزرگ شاعر)

اردو دنیا کے ایک معتبر اور کہنہ مشق شاعر مصطفیٰ جمیل بالاپوری کا منگل 20 مئی 2025 کی شب میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 83 برس تھی۔ ان کا ایک شعر ادبی دنیا میں مشہور ہوکر مصطفیٰ جمیل کی پہچان بن چکا تھا:

زندہ تھا تو کوئی پوچھتا نہ تھا
لیکن وہ جب مرا تو بڑا کام کرگیا

استاد شاعر مصطفیٰ جمیل مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکیڈمی کے رکن تھے۔ وہ انجمن انوارالاسلام جونیئر کالج بالاپور کے سکریٹری اور کئی سماجی، تعلیمی اداروں کے رہنما تھے۔ نماز جنازہ 21 مئی کی صبح ادا کی گئی اور تدفین صدیق شاہ بابا قبرستان، بالاپور (مہاراشٹر) میں عمل میں آئی۔ ♦♦

(واثق ندیم، کھامگاؤں بحوالہ کاغذ دکن بیورو، گلبرگہ)

اختر علوی (ادیب وشاعر)

اردو کے ادیب وشاعر اختر علوی (آغا اختر عباس علوی) کا جمعہ 16 مئی 2025 کو بنگلور میں انتقال ہوگیا۔ نماز جنازہ اور تدفین شیعہ قبرستان، مہوسورروڈ، بنگلور میں ہوئی۔

اختر علوی کی پیدائش یکم جنوری 1946 کو شہر یادگیر میں ہوئی تھی۔ ان کی کتاب 'ورق ورق پھول' 2009 میں منظر عام پر آئی تھی۔ ان کی رحلت کو ادبی دنیا کے لیے بڑا خسارہ قرار دیا گیا ہے۔ ♦♦ (سوگواران محبان اختر علوی کی خبر سے ماخوذ، کاغذ دکن بیورو، گلبرگہ)

نسیم مخموری (شاعرہ)

اردو زبان کی معروف شاعرہ نسیم مخموری کا جمعہ 23 مئی 2025 کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 80 برس تھی۔

محترمہ نسیم مخموری مشہور شاعر مخمور دہلوی کی بیٹی اور مشہور آرکیٹیکٹ موخان کی اہلیہ تھیں۔ نسیم مخموری صاحبِ ثروت خاندان سے تھیں۔ نواب پٹودی سے گھریلو تعلقات تھے۔ ان کی ایک بیٹی لبنیٰ انجینئر فیروز مظفر کی کلاس فیلو رہی ہیں۔

نسیم مخموری کی پیدائش 19 اپریل 1935 کو ہوئی تھی۔ ان کے دو شعری مجموعے 'صدف' اور 'مسافت ہجراں' شائع ہو چکے ہیں۔ ♦♦ (بشکریہ کاغذ دکن بیورو، گلبرگہ)

اثر بہرائچی (شاعر)

ہندوستان سے امریکہ تک ادبی دنیا میں اپنے مخصوص لب و لہجہ اور مترنم آواز کی بنا پر اپنا منفرد مقام بنانے والے شاعر سیّد مبشر حسین 'اثر بہرائچی' کا تقریباً 80 سال کی عمر میں سنیچر 22 مارچ 2025 کو انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی نماز جنازہ بعد نماز عشا شہر کے محلہ چکی میں واقع خانقاہ چھوٹی تکیہ سے متصل مدرسہ کے کیمپس میں پڑھی گئی اور تدفین چھوٹی تکیہ واقع قبرستان میں ہوئی۔

مرحوم سیّد مبشر حسین 'اثر بہرائچی' کی تین کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جس میں دو نعتیہ کلام کا مجموعہ شامل ہے۔ اثر بہرائچی ضلع کلکٹریٹ میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ پس ماندگان میں اہلیہ سمیت دو بیٹے اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔ ♦♦

(انقلاب، 23 مارچ 2025 سے ماخوذ)

راشد طراز (شاعر)

اردو کے معروف شاعر پروفیسر راشد طراز کا منگل 4 مارچ 2025 کو مونگیر (دلاور پور) میں انتقال ہوگیا۔ مونگیر کے آر ڈی اینڈ ڈی جے کالج سے وہ برسوں وابستہ رہے۔ سبکدوشی کے بعد مسلسل علیل رہتے تھے۔

پروفیسر راشد طراز ایک مستند شاعر کے طور پر اپنی شناخت رکھتے تھے۔ مونگیر (بہار) کی معروف ادبی انجمن 'اردو فورم' کی ادبی تقریب میں خاص طور سے شرکت کرتے تھے۔ ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آ کر داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔ شہر منافق، کاسہ شب، ستارہ شکستہ، غبار آشنا، گردش ناتمام، جہاں تک روشنی ہوگی اور 'صبح ازل' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ♦♦

(ماہنامہ اردو دنیا، اپریل 2025 سے ماخوذ)

دولت رام (مزاحیہ فنکار)

دکنی تہذیب کے علمبردار اور اسٹیج کی دنیا کے عظیم مزاحیہ فنکار دولت رام منگل 25 مارچ 2025 کی رات انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 82 برس تھی اور کچھ عرصے سے وہ علیل تھے۔ دولت رام حیدرآباد کی ادبی اور تہذیبی محفلوں میں بے حد مقبول تھے۔ وہ اردو زبان کے شیدائی تھے اور حیدرآبادی لہجے میں مزاح نگاری میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کا شہر کی قدیم تہذیبی انجمن فائن آرٹس اکیڈمی سے گہرا تعلق تھا۔ وہ فتح میدان کلب کے معزز رکن بھی تھے اور سیاسی و سماجی حلقوں میں ان کی بڑی عزت تھی۔ دولت رام کی آخری رسومات سندھی ہندو رسم و رواج کے مطابق عنبر پیٹ میں ادا کی گئیں۔ ◆◆

(ہفت روزہ گواہ، 4 تا 10 اپریل 2025 سے ماخوذ)

شوکت جمال (مزاحیہ شاعر)

معروف مزاح گو شاعر شوکت جمال کا جمعہ 7 مارچ 2025 کو اسلام آباد (پاکستان) میں انتقال ہو گیا۔ نماز جنازہ ہفتہ 8 مارچ 2025 کو بعد نماز ظہر بحریہ ٹاؤن، اسلام آباد میں ادا کی گئی اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

شوکت جمال نے ایک طویل عرصہ ریاض، سعودی عرب میں گزارا۔ چند برس قبل وہ مستقل طور پر وطن لوٹ گئے تھے۔ وہ خلیجی ممالک کے ادبی حلقوں میں بے حد مقبول تھے۔ شوکت جمال یہاں کے مشاعروں میں بڑے اہتمام سے مدعو کیے جاتے تھے۔ وہ ایک مخلص، یار باش، ملنسار، مہمان نواز اور اپنے حلقہ میں غیر متنازعہ شخصیت کے طور پر جانے جاتے تھے۔ وہ ہند و پاک کمیونٹیز میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ شوکت جمال زندہ دلان کی دعوت پر سالانہ مشاعرے میں شرکت کے لیے حیدرآباد (دکن) بھی تشریف لائے تھے۔ ان کی تخلیقات ماہنامہ 'شگوفہ' میں پابندی سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ ◆◆

(ہفت روزہ گواہ، 21 تا 27 مارچ 2025 سے ماخوذ)

پروفیسر عبدالقیوم شیخ (ادب شناس، اردو دوست)

شعبہ انگریزی ایس ایس اے آرٹس اینڈ کامرس کالج (سولاپور) کے استاد اور سابق صدر شعبہ انگریزی پروفیسر عبدالقیوم شیخ کا اتوار 27 اپریل 2025 کو انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً 83 برس تھی۔ پس ماندگان میں دو بیٹے انجینئر مجاہد، جنید شیخ اور ایک بیٹی شامل ہیں۔

پروفیسر عبدالقیوم شیخ کی پیدائش سولاپور میں ہوئی۔ یہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ پہلے سوشل اردو ہائی اسکول میں بطور معلم ان کا تقرر ہوا۔ بعد میں سینئر کالج میں پروفیسر ہوئے۔ فروری 2002 میں وہ صدر شعبہ انگریزی کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے۔ شعبہ انگریزی کو اردو کی ادبی دنیا میں وقار دلانے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ پروفسیر عبدالجلیل شیخ (صدر شعبہ اردو) مرحوم کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ پروفیسر عبدالقیوم اپنی سادگی، تواضح، عاجزی، خودداری اور صالح جذبات کے غیر معمولی عناصر کے سبب اپنے حلقے میں ممتاز تھے۔ وہ ادب شناس ہی نہیں بلکہ ادب نواز بھی تھے۔ ◆◆

(کاغذ دکن بیورو گروپ، گلبرگہ سے ماخوذ)

تاریخِ انصاریان (تذکرۂ علما و فضلا خاندانِ انصاریٔ کشمیر)

مصنف: مسرور عباس انصاری

ISBN 978-93-90579-72-3

صفحات: 472 (مجلد)، قیمت: -/500، اشاعت: مئی 2025

ناشر: سفینہ پبلی کیشنز، کرن نگر، سرینگر (کشمیر)۔

زیر اہتمام: اپلائڈ بکس، دریا گنج، نئی دہلی۔ فون: 011-44753890

نئی کتب

NEW ARRIVALS
Classified List

تحقیق و ترتیب: محمد عارف اقبال

اسلامیات: قرآنیات، سیرت، احادیث، فقہ

اسمائے کتب	مصنف/مؤلف/مترجم	صفحات	قیمت	ناشر/تقسیم کنندگان
آسان تفسیر قرآن (تیسواں پارہ)	مولانا محمد فاروق خاں/ نظر ثانی: نسیم احمد غازی فلاحی	240	200/-	مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی-25 Mobile: 9212117559
آؤ قرآن سمجھیں (تربیتی پہلو سے مطالعہ قرآن)	ڈاکٹر جاسم البلالی م: ذکی الرحمٰن غازی ندوی	256	250/-	المنار پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی-110025 Mobile: 9667072147
تحقیق وتدریسِ قرآن	پروفیسر ضیاء الدین ملک فلاحی	364	600/-	مصنف، علی گڑھ۔ Mobile: 9927206518
شمس پیرزادہ کی تفسیر دعوۃ القرآن	پروفیسر ضیاء الدین ملک فلاحی	184	415/-	پروفیسر خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن، علی گڑھ۔
فہم قرآن کے جدید رجحانات	پروفیسر ضیاء الدین ملک فلاحی	254	500/-	مصنف، علی گڑھ۔ Mobile: 9927206518
قرآنی مباحث: تفہیم وتجزیہ	اشہد رفیق ندوی	318	350/-	ادارہ تحقیق وتصنیف، علی گڑھ۔ M: 9412671962
قرآنی علوم کا ارتقا (عہد اسلامی کے ہندوستان میں)	ظفر الاسلام اصلاحی	234	500/-	پروفیسر خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن، علی گڑھ۔ Mobile: 9058281494
محدثات (علم حدیث کے ارتقا میں خواتین...)	ڈاکٹر محمد اکرم ندوی	408	400/-	مکتبہ حراء، لکھنؤ۔ موبائل: 7007892005

سماجیات: سائنس، سیاست، تعلیم، میڈیا

اسمائے کتب	مصنف/مؤلف/مترجم	صفحات	قیمت	ناشر/تقسیم کنندگان
اختلاف کے اسباب وآداب	پروفیسر سعود عالم قاسمی	64	100/-	مرکز برائے فروغ تعلیم وثقافت، AMU، علی گڑھ۔ Mobile: 9634751296
ازدواج، بچے، پرورش، تربیت	عبد العظیم رحمانی ملکاپوری	136	140/-	ذکری بکس، 507، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-6 Mobile: 9718100589
امیر باپ، غریب باپ	رابرٹ ٹی کیاسکی	280	400/-	مکتبہ حراء، لکھنؤ۔ موبائل: 7007892005
انسانی دماغ: کمپیوٹر اور تعلیم (2025)	انس مسرور انصاری	100	35/-	NCPUL، آر کے پورم، نئی دہلی-110066 Tel. 011-26109746
جنوبی ایشیا میں مذہبی شناختوں کی تشکیل (بریلوی دیوبندی نزاع کا تاریخی مطالعہ)	ڈاکٹر شبیر علی ترین	492	980/-	مکتبہ حراء، لکھنؤ۔ موبائل: 7007892005
درد، علامت اور علاج (تیسرا ایڈیشن)	ابوسعدی خالد جاوید	200	130/-	NCPUL، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
سفینۃ الاولیا	داراشکوہ، ترجمہ: محمد عثمان غنی	280	195/-	NCPUL، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
مدارس اسلامیہ کے طلبا سے خطاب	ڈاکٹر محمد اکرم ندوی	240	500/-	مکتبہ حراء، لکھنؤ۔ موبائل: 7007892005
معالجات (جلد اول تا چہارم) پانچواں ایڈیشن	وسیم احمد اعظمی (سیٹ)	2325	970/-	NCPUL، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

شخصیات: تاریخی، دینی، علمی، ادبی

اسمائے کتب	مصنف/مؤلف/مترجم	صفحات	قیمت	ناشر/تقسیم کنندگان
اختر آصف: حیات وخدمات	ڈاکٹر عارف انصاری	160	199/-	فاضلی اردو لٹریری اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، برہانپور۔ Mobile: 9993994141
تنویر احمد علوی (مونوگراف)	ثمر جہاں	170	120/-	NCPUL، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

دلیپ کمار: ملاقاتیں، یادیں، باتیں	فیصل فاروقی	232	395/-	ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ M: 9810784549
سیّد لطیف الرحمٰن (مونوگراف)	محمد اسلام	232	152/-	مغربی بنگال اردو اکادمی، کولکاتہ-700016
الشیخ سعید الاعظمی الندوی (حیات و آثار)	ڈاکٹر محمد فرمان ندوی	548	500/-	مکتبہ حراء، لکھنؤ۔ موبائل:7007892005
مشائخ دہلی کی جامع تاریخ	پروفیسر شریف حسین قاسمی	628	700/-	انجمن ترقی اردو (ہند)، 212 راؤز ایونیو، نئی دہلی-2
منشی عبدالقیوم خاں خطاط (مونوگراف)	معصوم مرادآبادی	160	125/-	NCPUL، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

ادب: انٹرویوز/آپ بیتی/سفرنامہ/خطوط

سوانح عمری: حاجی محمد سمیع اللہ خان بہادر سی ایم جی (دو حصے۔ اول، دوم)	شمس العلما خان بہادر مولوی محمد ذکاء اللہ	261	160/-	NCPUL، آر کے پورم، نئی دہلی-110066 Tel. 011-26109746
نمی رقصم (خودنوشت)	ڈاکٹر ابرار رحمانی	396	500/-	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔ Mob: 9971775969
وطن کے پھیرے (ہندوستان کے تین سفرنامے)	ڈاکٹر محمد اکرم ندوی	448	700/-	مکتبہ حراء، لکھنؤ۔ موبائل:7007892005
یادگارِ قرۃ العین حیدر (یادیں)	ڈاکٹر مجیب احمد خاں	528	700/-	اوکھلا وِہار، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ M: 9313790130

ادب: تحقیق و تنقید/لسانیات/نصابیات

ادبی آبِ حیات (تنقید)	جنگ بہادر گویل، مترجم: محمد زبیر	256	400/-	EPH، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی-110002
ادراکِ اردو ادب (بی اے، ایم اے کے طلبا کے لیے)	سیّد ساجد علی ٹونکی	208	300/-	سیّد داؤد علی، ٹونک۔ Mobile: 8441093005
اردو فکشن: ایک ناتمام قصہ (جلد اوّل)	علیم اسماعیل	255	400/-	GNK پبلی کیشنز، سری نگر۔ (کشمیر)
اردو میں تنقید کی روایت (تنقید)	عتیق اللہ	568	899/-	نامک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ M: 7428107304
اردو نعت اٹھارہویں صدی میں	ڈاکٹر طاہرہ انعام	280	1200/-	اردو نعت سینٹر، گلستانِ جوہر، کراچی۔ (پاکستان)
پریم چند: مطالعے کی نئی جہتیں	کمل کشور گوینکا، م: محمد صغیر حسین	——	165/-	NCPUL، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
پلامو اور نثری ادب (تحقیق و تنقید)	ڈاکٹر مقبول منظر، شرف الدین شیخ	296	500/-	EPH، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی-110002
تاثر نہ کہ تنقید	صدیق الرحمٰن قدوائی	170	399/-	نامک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ M: 7428107304
تعبیر یوسفی (تنقید)	خلیل الرحمٰن ایڈوکیٹ	256	550/-	نامک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ M: 7428107304
تلفظ (لسانیات) نیا ایڈیشن	شکیل حسن شمسی	184+24	135/-	NCPUL، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
عارفانہ اور متصوفانہ اشعار (تنقید)	شمیم طارق	144	250/-	ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ M: 9810784549
غالب اور میرٹھ (جلد اوّل)	ابراہیم افسر	544	650/-	ابراہیم افسر، میرٹھ۔ Mobile: 9897012528
نشریاتِ سرور (آل احمد سرور کی ریڈیائی تحریریں)	ڈاکٹر محمد شکیل اختر	376	580/-	EPH، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی-110002

ادب: افسانے/ناول/خاکے/طنز و مزاح/انشائیے/ڈرامے

بخت (سماجی رومانوی ناول)	مہر النساء شاہ میر	دو جلدیں	1400/-	مکتبہ حراء، لکھنؤ۔ موبائل:7007892005
تماشائی (افسانچوں کا مجموعہ)	محمد علیم اسماعیل	132	——	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔ Mob: 9971775969
دریدہ (افسانوں کا مجموعہ)	خورشید عالم	222	250/-	ڈاکٹر خورشید عالم، برولا، سیکٹر 49، نوئیڈا-201301
سمندر پر ایک اڑان (افسانوں کا مجموعہ)	اختر واصف	144	250/-	EPH، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی-110002

تاریخ و تذکرہ

تاریخ انصاریان (تذکرہ علما و فضلا...)	مسرور عباس انصاری	472	500/-	سفینہ پبلی کیشنز، سری نگر۔ (کشمیر)
خدا کے سرکش دوست (عہدِ وسطیٰ کے درویش، 1200 تا 1550)	احمد طغرل کارا مصطفی، ترجمہ: یعقوب یاور	160	299/-	نامک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ M: 7428107304

مشاہیر علم وادب کا گورکھپور سے ربط وتعلق	محمد عرفات اعظمی	216	250/-	ساجد علی میموریل کمیٹی، گورکھپور۔ M: 9936029463
یادوں کے چراغ (تذکرہ منتخب شخصیات)	اکبر رضا جمشید (سابق ضلع جج)	136	200/-	بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ-800004

ادب اطفال

نیکی کا نور (بچوں کے مضامین اور کہانیاں)	منظور پروانہ	102	150/-	منظور پروانہ، احاطہ سلیمان قدر، مولوی گنج، لکھنؤ-18
ہمارے حضور ﷺ (سیرت نبویؐ...)	محمد عارف اصلاحی	208	160/-	البدر بک سینٹر، اعظم گڑھ۔ M: 9839591434

شعری ادب

آئندہ (شعری مجموعہ)	سلیم محی الدین	264	349/-	ریختہ پبلی کیشنز (انڈیا)، نوئیڈا۔ (اتر پردیش)
اعتبارِ سخن (دوسرا شعری مجموعہ)	سائرہ عظیم	192	180/-	چیمبر 694، پٹیالہ ہاؤس کورٹ، نئی دہلی-110001
انتخاب کلام حماد انجم ایڈوکیٹ	ڈاکٹر شمس کمال انجم	136	200/-	EPH، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی-110002
پیکرِ انوار (مجموعہ نعت ومناقب)	وارث رفیع	168	200/-	51 سول لائن، بدایوں۔ Mob: 8535067557
چاند نکلا ہے (سیف سمستی پوری کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ)	ڈاکٹر محمد حسن خان	612	600/-	حسن پورہ، لال بازار، کلٹی، بردوان (مغربی بنگال) Mobile: 8250750227
دیوانِ اقبال (غزلیات علامہ اقبال مع متروکات)	اخلاق آہن	320	800/-	نامک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ M: 7428107304
سُرور (پاکٹ سائز، شعری مجموعہ)	پروفیسر اخلاق آہن	195	199/-	نامک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ M: 7428107304
شعری جواہرات اور ضرب الامثال	محمد رمضان عبدالشکور	216	150/-	اسلامپورہ، مالیگاؤں۔ Tel. 02554-232961
طلب گار اسفارِ زندگی (شعری مجموعہ)	عقیل کنٹریکٹر طلب گار	192	400/-	نیوز ٹاؤن پبلشرز، ممبئی۔ Mob: 9820038704
فغانِ اقصیٰ (شاعری)	اخلاق آہن	64	150/-	نامک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ M: 7428107304
گلدستۂ غزل (آن لائن طرحی مشاعرے کا مجموعہ)	فہیم پرتاپ گڑھی، آفتاب جونپوری	204	250/-	مرتبین، پرتاپ گڑھ۔ Mob: 7599101135
نقش قدم (شعری مجموعہ)	نیاز انصاری	126	200/-	حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ M: 9696066972
نقشِ مصور (شعری مجموعہ)	نیاز انصاری	128	350/-	نیاز انصاری، بنارس۔ M: 9696066972

رسائل وجرائد: خصوصی اشاعت

اِدراک، گوپال پور (شکیل الرحمٰن کے افسانے)، ایڈیٹر: پروفیسر سیّد حسن عباس، مشترکہ شمارہ 2018 تا 2024، صفحات 328، قیمت -/300،

پتہ: مرکز تحقیقات اردو فارسی، گوپال پور، سیوان۔ (بہار) موبائل: 9839337979

چراغِ نور، سہ ماہی (خصوصی اشاعت پروفیسر حمید سہروردی)، ایڈیٹر: ڈاکٹر انیس صدیقی، مبین احمد زخم، جون 2025، صفحات 240، قیمت -/200،

پتہ: چراغ نور، سہ ماہی، یادگیر-585201 (کرناٹک)۔ موبائل: 9110485590

زندگی نو، ماہنامہ (تحقیقی ادارے اور فکر گاہیں)، ایڈیٹر: سیّد سعادت اللہ حسینی/ محی الدین غازی، جون 2025، صفحات 114، سالانہ -/400،

پتہ: مینیجر زندگی نو، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-110025۔ موبائل: 9891160829

شگوفہ، ماہنامہ (بہ یاد سیّد عباس متقی)، ایڈیٹر: ڈاکٹر سیّد مصطفیٰ کمال، اپریل، مئی 2025، جلد 58، صفحات 60، سالانہ -/400،

پتہ: سیّد مصطفیٰ کمال، حیدر آباد۔ موبائل: 9885202364 — 9703699894

عالمی جائزہ (ابن صفی نمبر)، مدیر: اے رحمان، اپریل 2025، صفحات 650، قیمت -/1500، عالمی اردو ٹرسٹ، دہلی ۹۱۔ Mob: 9318347431

مجلّہ ارمغان (13)، ایڈیٹر: پروفیسر احمد محفوظ، ڈاکٹر شاہ عالم، جلد 10، شمارہ 13، 2024، صفحات 496، قیمت درج نہیں،

پتہ: شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-110025۔ فون: 011-26981717

ندائے نسواں، ماہنامہ، ایڈیٹر: ف خ مسرت، سیّدہ ہما غضنفر جاوید، جلد 2، شمارہ 4-3، مارچ اپریل 2025، صفحات 102، قیمت درج نہیں،

4-5 ہدیٰ ٹاور، دیگلور ناکہ، ناندیڑ (مہاراشٹر)۔ موبائل: 9657655569

نشانِ راہ (کتابی سلسلہ۔1)، ایڈیٹر: ارشد سراج الدین مکّی، شمارہ 1، اپریل تا جون 2025، صفحات 64، قیمت 50 روپے،

پتہ: مجلّہ نشانِ راہ، D-19 گلی نمبر 2، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025۔ موبائل: 9899545546 ❑❑❑

ابن صفی کی عصری معنویت

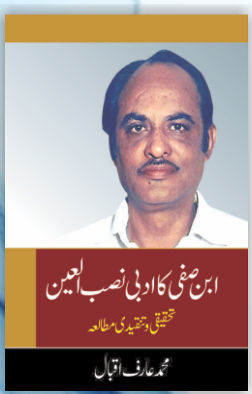

ابن صفی کا ادبی نصب العین

تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

مصنف: محمد عارف اقبال

ابن صفی کی تخلیقات میں مستقبل کی آگہی اور زبان وادب کے
گراں قدر علوم پوشیدہ ہیں

اردو اکادمی دہلی سے اول انعام یافتہ کتاب

صفحات: 312، اشاعت: 2018، قیمت: -/300 روپے

ISBN 978-93-83239-81-8

فلسفی ابن صفی

تالیف و ترجمہ: ایم طاہر

ابن صفی کے ناولوں سے 283 متنوع موضوعات پر
منتخب اقتباسات کا مجموعہ
اردو اقتباس کے ساتھ انگریزی ترجمہ
نئی نسل کے لیے گراں قدر تحفہ

صفحات: 144، اشاعت: جون 2022، قیمت: -/250 روپے

ISBN 978-93-90579-43-3

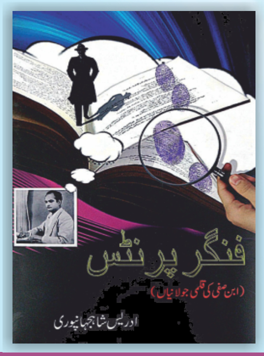

فنگر پرنٹس (ابن صفی کی قلمی جولانیاں)

تحقیق و ترتیب: ادریس شاہجہانپوری

اُن تمام ثقہ حضرات کے نام جنہوں نے اپنی خلوتوں میں بیٹھ کر
ابن صفی کی تخلیقات سے حظ تو اٹھایا لیکن روز روشن میں
ان کی عظمت کا اعتراف کرنے کا حوصلہ نہ کر سکے

صفحات: 808، اشاعت اول: مارچ 2021، قیمت: -/850 روپے

ISBN 978-93-5457-057-5

رابطہ: اردو بک ریویو، نئی دہلی Mobile: 9953630788

یہ جگہ اشتہار کے لیے خالی ہے

URDU BOOK REVIEW QUARTERLY
NEW DELHI-110 002
Ph.: (Office) 011-44753890, Mobile: +91-9953630788

R.N.I. No. 63106 / 95
VOL. XXXI ISSUE NUMBER - 42
April, May, June - 2025

’آل انڈیا یونانی طبّی کانگریس‘

فروغِ طب کی ایک مکمل تحریک ہے

آپ بھی ممبر بن کر اس تحریک کا حصہ بن سکتے ہیں!

ممبرشپ حاصل کرنے کے لیے دو عدد فوٹو، ووٹر آئی ڈی یا آدھار کارڈ کی فوٹو کاپی

اور ایک ہزار روپے کا ڈی ڈی کسی بھی بینک سے

"ALL INDIA UNANI TIBBI CONGRESS"

کے نام بنوا کر مرکزی دفتر ’آل انڈیا یونانی طبّی کانگریس‘ کو رجسٹرڈ ڈاک سے ارسال کریں۔

مرکزی دفتر

آل انڈیا یونانی طبّی کانگریس

D-49، نیو سیلم پور، نزد شہید اشفاق اللہ خاں پارک، دہلی-110053

Branch Office

Sadar Unani Clinic, 1739/2, M.P. Street, Pataudi House,
Darya Ganj, New Delhi - 110002

Tel.: 011-47524630 / 9810429359 / 7893246825

E-mail: aiutcongress@gmail.com, mahmad1952@yahoo.com

Website: www.aiutc.com

Printed, published and owned by **Mohammad Arif Iqbal**, Printed at Asila Offset Printers, 1307-08, Kalan Mahal, Darya Ganj, New Delhi-2 and published from 1739/3 (Basement) New Kohinoor Hotel, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-110002 *Editor :* **Mohammad Arif Iqbal**

ISSN 0971-9288